عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

ایک ملی اسلامی مجلہ

اکتوبر ۱۹۳۸ء

ایک

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

رامباغ روڈ کراچی

مرتب
محمد یونس

بدلِ اشتراک
سالانہ دس روپے
ششماہی چھ روپے
خرچ رجسٹری سالانہ دو روپے چار آنے

جلد ۱ نمبر ۱۰
قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

فہرست

قائدِ اعظم کا انتقال (نظم)	اسد ملتانی	۱
لمعات		۴
نظامِ شریعت کی بنیاد	جناب پرویز	۲۵
بقیہ " " "	صفحہ ۳۰ سے آگے صفحہ ۸۰ پر دیکھئے	
عورت کا فریضۂ زندگی		۳۳
اسلامی پردہ	حکیم محمد حسین عرشی	۳۹
اسلام کا نظریۂ جہاد	حکیم حیدر زمان صدیقی	۴۹
حقایق و عبر		۸۱
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش		۹۰
وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِہِمُ الْعِجْلَ	(بقیہ صفحہ ۹۴ پر دیکھئے)	۹۵

قائدِ اعظم کا انتقال

یک لخت ہم سے قائدِ اعظم جدا ہوا
آتا نہیں سمجھ میں کہ آخر یہ کیا ہوا

ہم سے کہا گیا کہ وہ بالکل ہیں تندرست
پھر دفعتہً یہ کیسا مرضِ لا دوا ہوا

جس کا خیال تک بھی گوارا نہ تھا ہمیں
وہ حادثہ بچشم زدن رونما ہوا

یک دم ہوا یہ قائدِ اعظم کا انتقال
یا آسماں سے حملۂ برقِ بلا ہوا

صدمہ وہ آپڑا ہے اچانک کہ الاماں
ہر چشم اشکبار ہے ہر دل بجھا ہوا

آنکھوں کے سامنے ہیں کڑی منزلیں ابھی
کس وقت قافلے سے الگ رہنما ہوا

دل مانتا نہیں کہ محمد علی جناح
ملت کو چھوڑ اور کہیں چل کھڑا ہوا

آیا نہ عمر بھر جو کسی کے فریب میں
کیونکر شکار وہ ملک الموت کا ہوا

ہل ہی سکا کبھی نہ طمع سے نہ خوف سے
تھا حق کی راہ میں قدم ایسا جما ہوا

راہِ طلب میں اس کو نہ ہٹنا پڑا کبھی
ہر روز اس کا تھا قدم آگے بڑھا ہوا

ہر دم سیاست اُس کی رہی مرکزِ دفنِ پاک
جو کچھ ہوا اعلانیہ و برملا ہوا

ایماں کے زور سے تھا وہ جسمِ نحیف و نزار
سب کے مقابلے میں اکیلا ڈٹا ہوا

مُسّی کو تیغ و سِپر ڈالنی پڑی
جو سورما بھی اس سے نبرد آزما ہوا

"لڑتا تھا اور ہاتھ میں تلوار بھی نہ تھی"
پھر فتحیاب بھی وہی مردِ خدا ہوا

تسخیرِ مُلک کیسے ہو بے تیغ و بے تفنگ
دیکھی جو اس کی جنگ تو یہ عقدہ وا ہوا

آزاد انہیں کرا دیا منوا کے اپنا حق — اغیار کے لئے بھی وہ مشکل کُشا ہوا

اُس کے خلوص کا یہ اثر دیکھ لو کہ آج — ہے احترام سے سرِ دشمن جھکا ہوا

بے شک وہ بعد حضرت اورنگ زیب کے — اسلامیوں کا سب سے بڑا رہنما ہوا

اُمّت کا وہ رشید خلف جس کے دور میں
رقبہ وسیع عالمِ اسلام کا ہوا

کیا اتفاق ہے کہ بہت گھوم پھر کے بھی — پیدا ہوا جہاں وہیں نذرِ قضا ہوا

وہ شاہراہ نام ہے جس کا "جناح راہ" — قبرِ جناح کا بھی وہی راستہ ہوا

آجا رہے ہیں لوگ زیارت کے واسطے — دن رات اس کے مزار پہ تانتا بندھا ہوا

آنکھوں میں اشک بھر کے، لحد پر چڑھا کے پھول — قرآں سرا ہوا، کوئی محوِ دعا ہوا

کس درجہ حق پرست تھا وہ مردِ پاکباز — حاصل جبھی تو مرتبۂ اولیا ہوا

خلقِ خدا میں بسکہ وہ محبوبِ عام تھا
مقبولِ خاص بارگہِ کبریا ہوا

پہلے ہی گرچہ دل تھا ہمارا دکھا ہوا — صبر اس پہ ہے کہ غم ہے خدا کا دیا ہوا

ہر چند ہے ہماری تمنا کے برخلاف — بے جا وہ کب ہوا جو بحکمِ خدا ہوا

اللہ کا اگر تھا سہارا تو اب بھی ہے انساں کا آسرا تھا تو ختم آسرا ہوا

ہم کو سبق ملا کہ کسی ملک و قوم کا اک فرد سے نہیں ہے مقدر بندھا ہوا

رکتا ہے کارخانۂ قدرت بھلا کہیں

لاکھوں ہی کارکن ہوئے رخصت تو کیا ہوا

دل کی ہے اور بات مگر واقعہ یہ ہے قائد تو اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوا

جو بھی گیا وہ ٹھیک نشانے پہ جا لگا اس کی کماں کا تیر نہ کوئی خطا ہوا

اللہ نے کیا اسے مقصد میں کامیاب حاصل حیات ہی میں دلی مدعا ہوا

جس کام کا خیال تھا پورا کیا اسے جب مل چکی مراد تو ہم سے جدا ہوا

ہے سیرت جناح دو لفظوں میں اس قدر پایا جو عین حق وہ کہا، جو کہا، ہوا

تاریخ میں مثال نہیں اس کمال کی زور خرد سے ملک ہی پیدا نیا ہوا

دن رات اب تو چاہیئے کوشش یہی اسد

مضبوط ہو وہ ملک جو ہم کو عطا ہوا

(اسد ملتانی)

لمعات

مارچ ۱۹۴۰ء میں، جب ملت اسلامیہ نے لاہور میں، اس مرد درویش کی قبر کے سرہانے جس نے کاروان ملت کے منتشر افراد کے سامنے ان کا نصب العین زندگی رکھ کر انہیں نشان راہ سے روشناس کرایا تھا، اس نصب العین کے حصول کے لئے اپنے عزم راسخ کا اعلان کیا، تو ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے اس رہبر فرزانہ کی خدمت میں، جسے مبدء فیض کی کرم گستری نے اس مقصد عظیم کے حصول کے لئے چن لیا تھا، ایک سپاس نامہ پیش کیا تھا جسے ہزاروں آنکھوں نے پڑھا اور لاکھوں کانوں نے سنا۔ بعد میں اس سپاسنامہ کے الفاظ کو بار بار دہرایا گیا۔ لیکن جس رنگ میں اسے آج دہرایا جا رہا ہے اس سے پیشتر کبھی نہ دہرایا گیا ہوگا۔ کہ اس وقت ان الفاظ کو دل کے جوش، نگاہوں کی چمک اور پیشانی کی شگفتگی سے کسی سننے والے کے سامنے پیش کیا جاتا تھا اور آج یہی الفاظ اس سننے والے کی یاد میں، خاموش آنسوؤں کی شکل میں ملت کے دلِ دردآگیں کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ آج ہم ان الفاظ کو دہرانا اس لئے چاہتے ہیں کہ اس عہد رفتہ کو واپس بلانے کے لئے، جس میں اس جد و جہد کی ابتدا ہوئی تھی، جس کی انتہا مملکت پاکستان کے محسوس و مشہود پیکر میں آج ہمارے سامنے ہے، ان الفاظ سے زیادہ کامیاب صورت اور کوئی نہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس میر کارواں کی قیادت میں، قافلہ ملت کے سفر کا آغاز کن حالات میں ہوا اور اس کی راہنمائی نے اسے کن کن صعوبات اور مشکلات سے گذار کر مقام مقصود تک پہنچا دیا۔ وہ سپاسنامہ یہ تھا۔

پیشرفت نظر!

شیر بیشۂ بیباکی و حریت۔ ضیغم نیستان جرأت و بسالت۔ شاہین افلاک تدبر و سیاست پروانۂ شمع اخوت و حمیت۔ طرۂ کلاہ ملک و ملت۔ بطل جلیل ہندیاں۔ و قائد اعظم اسلامیاں، عظمت مآب محترم المقام جناب محمد علی جناح مدظلہ العالی حریت نواز! ذرا تصور میں لایئے ایسے وقت کو کہ ایک وحشت انگیز ہولناک بیابان میں راہ گم کردہ مسافروں کا ایک بکھرا ہوا قافلہ نشان منزل سے مایوس ہو کر ضعف عزیمت

سے پاشکستہ بیٹھ چکا ہو۔ ایک درماندہ راہرو کی صدائے دردناک جو آوازِ رحیل کا کام دے رہی تھی، فطرت کے اٹل قوانین کے ماتحت خاموش ہو چکی ہو۔ شام کا بھیانک سناٹا سر پر منڈلانے والی شب تیرہ و تار کی ہیبت انگیزیوں کا پیام جاں کاہ دے رہا ہو غاروں میں چھپے ہوئے درندوں کے پاؤں کی آہٹ موت کو قریب تر لاتی نظر آ رہی ہو۔ درختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے رہزنوں کی ریشہ دوانیاں دامن صحرا پر پھیلتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ بڑھتی چلی آ رہی ہوں۔ وہ لوگ جن کی قیادت و سیادت پر بھروسہ تھا، برادران یوسف کی طرح اپنے قافلہ کی گراں بہا متاع دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کی فکر میں ہوں۔ غرضیکہ ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل معلوم ہوتی ہو۔ افراد قافلہ میں سے جن کے دلوں میں اس الم انگیز کیفیت کا احساس ہو، ان کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھ رہی ہوں کہ دور افق کے اس پار سے ایک شاہسوار رواں دواں امیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لئے ان سوختہ سامانوں کی طرف بڑھتا چلا آئے منتشر افراد کارواں کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دے اور اپنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت و بربادی کی گھاٹیوں سے بچاتا ہوا انہیں کسی محفوظ مقام کی طرف لیجانے کی فکر کرے۔ اندازہ فرمائیے کہ جو قلبی کیفیت اس وقت ان راہ گم کردہ مسافروں کی ہوگی، وہی حالت آج ملت اسلامیہ (ہندیہ) کی ہے۔ تحریک آزادی کے آغاز میں مسلمانوں کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذرّوں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انہیں ادھر سے ادھر اڑائے جاتا۔ پانی کی رو آتی اور انہیں اپنے ساتھ بہائے جاتی۔ اس کاروان بے سالار کی متاع گراں بہا کو لوٹنے کے لئے چاروں طرف سے قومیں ہجوم کرکے آ رہی تھیں۔ غیر تو غیر خود اپنوں کی یہ حالت تھی کہ انکی سحر طرازیاں اور فسوں سازیاں ملت بیضا کو خدائے طور سینا سے ہٹا کر گوسالہ پرستی کی دعوت دیتی تھیں، غرضیکہ حالت یہ تھی کہ

نشان راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو ترس گئے تھے کسی مرد راہ داں کیلئے

قوم کی صحیح راہنمائی کرنے والے ایک ایک کرکے چل بسے تھے۔ بزم ملت کی آخری شمع جس کی ضیا پاشیوں سے لاکھوں آنکھیں پرنور تھیں، ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو بجھ چکی تھی۔ اس کس مپرسی اور بے کسی کے عالم میں اللہ تعالے نے اس منتشر قافلہ کی شیرازہ بندی

کے لئے آپ کی ذاتِ گرامی کو چن لیا اور آپ کی نگہ دوررس نے اس قافلہ کو بتایا کہ ان کے گردوپیش کس کس قسم کی خطرناک گھاٹیاں موجود ہیں وہ گھاٹیاں کہ جن میں کہیں متحدہ قومیت کے دامِ ہمرنگ زمین میں کبوترِ حرم کو پھانسنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں کہیں کسی منبر سے یہ آواز آرہی تھی کہ قومیں مذہب سے نہیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اور یوں اس طائر لاہوتی کے بال و پر کو غبار آلودہ ارض دبوم بنا کر امتِ رسولِ کافۃ الناس کو جغرافیائی حدود کی آب و گل میں محبوس کیا جارہا تھا کہیں۔ امرھم شوریٰ بینہم کی حامل قوم کی نگاہوں میں مخلوط انتخاب کے سراب کو آبِ حیواں بنا کر دکھایا جارہا تھا، کہیں اس اولی الامر منکم کی مامور جماعت کیلئے غیرمسلموں کی امامت و قیادت کو عین دین قرار دیا جارہا تھا، کہیں انگریز کے خلاف "متحدہ محاذ" کے طلسم سے کفار و مشرکین سے تولی کے جواز کے فتاویٰ شایع ہو رہے تھے۔ ایک طرف ایک مغنی آتش نفس سرودگاہ دار دھا کی استعارے میں یہ خواب آور گیت گا رہا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ اس لئے اسلام کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ دوسری طرف کچھ خداوندان مکتب شاہین بچوں کے لئے احساس کی بازو شکن تعلیم کی اسکیمیں تیار کر رہے تھے۔ ہندو اپنے ذہن میں "رام راج" کے قیام کے منصوبے باندھ رہا تھا اور اس کے لئے انگریز سے شریفانہ معاہدے (Gentleman's agreement) استوار کر رہا تھا۔ ہندوؤں کے شور و غوغا سے متاثر انگریز بھی مسلمانوں کو بلا تامل ہندو کے ہاتھ میں دینے پر آمادہ تھا کہ وہ اپنی پانچ ہزار سالہ غلامی کا جذبۂ انتقام اس کے خون سے ٹھنڈا کرے۔ جو لوگ اغیار کی صفوں میں کھڑے ہو کر ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کا دعویٰ کر رہے تھے ان میں اتنا سمجھنے کی بھی استطاعت نہ تھی کہ بساطِ سیاست پر آئینی مہرے کس طرح چلائے جارہے ہیں۔ ہندو خوش تھا کہ میں نے ۹ کروڑ فرزندانِ توحید کو اچھوتوں کی صف میں ملادیا۔ انگریز راضی تھا کہ وہ خنجرِ ہلال جس کے بے نیام ہونے کے خوف سے کلیجۂ صلیب میں ہمیشہ دھڑکن رہتی تھی اسے گنگا کی لہروں میں بہا دیا گیا۔ کہ اس کس مپرسی کے عالم اور اس خلفشار و تشتت کے وقت آپ آگے بڑھے اور ہندوؤں اور انگریزوں کے ہر خفیہ منصوبے اور ہر پوشیدہ سازش کو ایک ایک کر کے بے نقاب کر دیا، اور یوں ان کے تصورات کی حسین دنیا کو ایک خوابِ پریشاں میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اور ساری

دنیا پر اس حقیقت عظمیٰ کو واضح کر دیا کہ

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

بطل جلیل القدر!

ہمیں خوب احساس ہے کہ آپ کی منزل کس قدر کٹھن اور راستہ میں کس قدر مشکلات کا سامنا ہے۔ جہاں تک غیروں کا تعلق ہے مسلمان جیسی منتشر قوم کے مقابلہ میں ہندوستان اور برطانیہ کی دو بڑی قوتوں کا متحدہ محاذ ہی کچھ کم سنگ گراں نہیں لیکن غیروں سے کہیں زیادہ مہیب اور جاں گداز مشکلات خود اپنوں کی پیدا کردہ ہیں ان " اپنوں " کو بھی چھوڑیئے جو محض اپنی سنہری اور روپیلی مصلحت کوشیوں کی خاطر نشرگاہ وار دھا (Radio Station) کے آلۂ مکبر الصوت (Loud Speakers) بنے ہوئے ہیں۔ وہ تو اس مخالفت پر مجبور ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ماتم توان مخلص منافقین "کا ہے جن کی رفاقت و حمایت بیش از یں نیست کہ

کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

جن کا مقصد وحید اپنے طرۂ وجاہت کا قیام و بقا ہے۔ خواہ یہ آستانۂ خواجہ یثرب سے وابستگی ظاہر کرنے سے حاصل ہو جائے، یا لشکر بولہبی میں شمولیت سے۔ بایں ہمہ نہ ان غیروں کا ہجوم مخالفت ایسا ہے کہ اس سے کچھ خوف کھایا جائے اور نہ اپنوں میں سے بعض کی نوازشہائے بیجا اور دوسروں کے طعنہ ہائے دل خراش ایسے کہ ان کا غم کھایا جائے۔ کہ جو حق پر ہو اسے کسی کی مخالفت کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون تیری گھات میں اب تک

مگر کیا غم کہ تیری آستیں میں ہے ید بیضا

حریت مآب!

ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ تگ و دوِ حیات میں جو نصب العین آپ کے سامنے ہے وہ وہی ہے جو ہر مسلمان کی نگاہوں کے سامنے ہونا چاہیئے جس کے دل میں بہ حیثیت مسلمان زندہ رہنے کی تڑپ اور اپنی نسلوں کو بہ حیثیت مسلمان کے دیکھنے کی آرزو موجزن ہے اور کسے معلوم نہیں کہ وہ نصب العین ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (Muslim India) کی تشکیل ہے۔ راہ [illegible] ہیں۔ جس طرح آپ

دہلی میں اپنی تقریر کے دوران میں قائدِ اعظم نے کہا تھا۔

تم جانتے ہو تمہاری مسلم لیگ کیا ہے؟ ایک صدر! اس کا اسٹینو گرافر اور ایک اٹیچی کیس

یہ تھی وہ بے سرو سامانی جس میں یہ مردِ خود آگاہ اٹھا اور انگریز اور ہندو، دونوں کے متحدہ محاذ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اور اس بے سرو سامانی پر ہنسنے والی دنیا سے برملا کہدیا کہ

بے دست و پا نیم کہ ہنوز از دفورِ عشق
سودا ست در سرم کہ با ساماں برابر است

یہ "سامان" کیا تھا؟ وہی سامان جو دنیا میں بلند مقاصد کے حصول کی جد و جہد کرنے والوں کے پاس ہمیشہ سے رہا ہے اور جو خرچ کرنے پر بھی کم نہیں ہوتا بلکہ اور زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ سامان تھا۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم

اپنے نصب العین کی صداقت پر غیر متزلزل یقین، اس کے حصول میں غیر منقطع جد و جہد اور ہر اس شے سے محبت جو اس نصب العین کے حصول میں ممد و معاون ہو۔ تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھئے، بلند مقاصد کے لئے اپنی زندگیاں وقف کرنے والوں کی ہمیشہ یہی حالت ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۰-۳۶ء میں جب یہ بطلِ جلیل اس آواز کو پہلی مرتبہ لیکر اٹھے ہیں تو (جیسا کہ انہوں نے ایک مرتبہ ایک تقریر میں خود کہا تھا) حالت یہ تھی کہ یہ لاہور گئے تو کسی نے اپنے یہاں ٹھہرنے کے لئے نہیں کہا اور انہیں ہوٹل میں رات کاٹنی پڑی۔ پشاور گئے ہیں تو سرکٹ ہاؤس میں ٹھہرے لیکن کوئی شخص ملنے تک کیلئے نہیں آیا۔ اور دو تین برس کے بعد جب (سنہ ۱۹۴۰ء میں) پھر لاہور گئے ہیں تو سارا پنجاب دیدہ و دل فرشِ راہ کئے استقبال کے لئے موجود تھا۔ یہ کیا تھا؟ محض حق و صداقت کی آواز کا اثر۔ ورنہ انہوں نے پہلے دن سے وقتِ آخر تک، کبھی کوئی ایسا حربہ استعمال نہیں کیا جس سے عام طور پر عوام کی ہر دل عزیزی حاصل کی جایا کرتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۶ء کا ذکر ہے جب مسٹر جناح، پہلی مرتبہ "قائدِ اعظم" کی حیثیت سے شملہ تشریف لے گئے۔ مسلمانانِ شملہ نے اپنے محبوب قائد کے استقبال میں ایسا پرشکوہ جلوس مرتب کیا جس کی نظیر اس سے پیشتر کبھی کسی نے نہ دیکھی تھی۔ جلوس ریلوے اسٹیشن سے چلکر مال روڈ کے راستے تار گھر کے قریب تک آپہنچا، وہاں سے اسے نیچے کے بازار کی طرف جانا تھا۔ اس بازار میں عوام کا ہجوم تھا جو ملتِ اسلامیہ کے قائد کو اُس ہیٹ کے ساتھ دیکھنے کا متوقع نہ تھا، جو حسبِ عادت جناح صاحب کے زیبِ فرق تھا۔ بعض حساس قلوب نے باہمی اشارے کئے اور یہ سوچا کہ اس ہیٹ کے بجائے اگر جناح صاحب برہنہ سری رکھشا میں بیٹھے رہیں تو بھی عوام کے نزدیک زیادہ قابلِ اعتراض نہ ہوگا۔ انہوں نے اپنے میں سے ایک شخص کو جس پر جناب جناح بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے، اس کے لئے آمادہ کیا کہ وہ اس احساس کو ان تک

پہنچادیں۔ وہ خاموشی سے ہجوم کو چیرتے ہوئے ان تک پہنچے اور ان کی خدمت میں باادب گذارش کی۔ کہ لوگوں کا یہ خیال ہے۔ جناب جناحؒ نے اس مشفقانہ تبسم کے ساتھ، جو ان ہی کے ساتھ مختص تھا اور کسی کو نصیب نہیں ہوا، ان سے کہا:-

> تمہارا جذبہ بجا اور احساس درست ہے۔ لیکن اس کی فکر نہ کرو۔ محمد علی ان سطحی حربوں سے پاپولر نہیں بننا چاہتا۔ اگر اس میں خلوص اور خدمت کی جاذبیت ہوگی تو یہ خود بخود مقبول ہو جائے گا اور اگر یہ نہیں ہوگا تو اس طرح حاصل کی ہوئی ہر دل عزیزی بڑی ناپائیدار ہوگی۔

یہ ۱۹۳۶ء کا ذکر ہے۔ اس کے بعد ان کی دس سال کی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ آپ کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں پیش کر سکتے جس سے یہ ظاہر ہو کہ انہوں نے عام مقبولیت (یا پولیریٹی) حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی کیا ہو۔ بلکہ (اس کے برعکس) عوام میں ہر دل عزیز بننے کے لئے عام طور پر جن خصوصیات کو ضروری سمجھا گیا ہے، ان میں وہ بھی نہ تھیں۔ نہ وضع قطع، نہ تراش خراش، نہ رکھ رکھاؤ۔ حتیٰ کہ نعرہ شاعرانہ تقریبازی۔ جس کی قوم اس قدر خوگر ہو چکی تھی۔ نہ نصب العین کے مقابلہ میں کسی کے جذبات کی رعایت، نہ کسی کی خاطر اصول سے ایک قدم بھی انحراف۔ یہ وہ چیزیں تھیں جن سے اچھے اچھے مقبول عوام بھی، غیر مقبول ہو جاتے ہیں لیکن ایک یہ مرد خود شناس تھا کہ ان تمام موانعات کے باوجود ایسا ہر دل عزیز ہوا کہ اس کی موت پر کروڑوں آنکھوں نے رات کی تنہائیوں میں، جب کہ خدا کے سوا اور کوئی دیکھنے والا نہ تھا، چپکے ہی چپکے آنسو بہائے اور ہر قلب نے یہ محسوس کیا کہ اس کا خود اپنا ایک حصہ الگ ہو گیا ہے۔ میرے گھر کا دیا بجھنے سے میرے ہی گھر میں اندھیرا ہوتا ہے۔ پڑوس والے کے ہاں بدستور روشنی رہتی ہے۔ لیکن سورج غروب ہو جانے سے ہر ایک کے گھر میں تاریکی کی سیاہ چادر بچھ جاتی ہے۔ یہ مقام اسی کو حاصل ہوتا ہے جو اپنی روشنی کو کسی خاص چار دیواری میں محصور نہ رکھے بلکہ ان حدود و قیود سے بلند ہو کر اپنی روشنی کو عام کر دے۔ تاریخ کی رسدگاہوں سے جا کر پوچھئے یہ مقام بلند اسی کے حصہ میں آتا ہے جو بغیر کسی ذاتی غرض و غایت کے، حق و صداقت کے نصب العین کے حصول میں اپنی زندگی کو وقف کر دے۔ ذرا سوچئے کہ بالآخر ہمارے پاس وہ کونسی متاع تھی جسے لیکر ہم اس بازار بیع و شریٰ میں نکلے تھے! ہمارے پاس تو وہ سوت کی انٹی بھی نہیں تھی جسے لیکر وہ بڑھیا یوسف کی خریداری کے لئے بازار مصر میں آئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ۔ ایک پلیٹ فارم، ایک جھنڈا، ایک نصب العین یہ تھی ہماری متاعِ قوم۔ لیکن ذرا اپنے دلوں کی دنیا ٹٹولئے اور سوچئے کہ کیا یہ الفاظ فی الحقیقت آپ کے دلوں کی ترجمانی کیا کرتے تھے یا محض زبان سے ادا ہو جایا کرتے تھے، کیا ہمارے اتحاد میں ائتلاف کی وہ کیفیت

پیدا ہو گئی تھی جو دلوں کو جوڑ دیتی ہے۔ یا حالت محض یہ تھی کہ تحسبہم جمیعًا و قلوبھم شتّٰی۔ (تم انہیں اکٹھا تو دیکھ رہے ہو لیکن ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں) اپنے دلوں سے پوچھئے اور جو جواب وہاں سے ملے اس کے بعد سوچئے کہ کیا ہمارے پاس وہ متاع بھی فی الحقیقت موجود تھی جس کا ہم دعویٰ کیا کرتے تھے جب یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی تو پھر اندازہ ہو سکے گا کہ دنیا میں ایک شخص کا خلوصِ عمل اور کیریکٹر کیا انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ دنیا میں نابغہ (Genius) کی تخلیق کا راز ابھی تک ارباب فکر و نظر کے لئے ایک لاینحل معمہ بنا ہوا ہے۔ کلیہ قاعدہ یہ ہے کہ انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے۔ اسی لئے جب لوگ اپنے عام لیڈروں کی شکایات کرتے ہیں تو انہیں کہہ دیا جاتا ہے کہ جیسی قوم ویسے لیڈر۔ جیسا دودھ ہو گا ویسی ہی اس پر بالائی آئے گی۔ لیکن جب (Genius) پیدا ہوتا ہے تو وہ وراثت اور ماحول کے تمام قاعدوں کو توڑ دیتا ہے۔ پھر، اکثر (Genius) تو وہ ہوتے ہیں جن کا کمال ان کی ذات یا زیادہ سے زیادہ ایک خاص علاقہ تک محدود رہتا ہے، لیکن بعض (Genius) ایسے بھی پیدا ہوتے ہیں جن کا دائرۂ اثر و نفوذ، افراد سے آگے گزر کر، قوموں تک کو محیط ہو جاتا ہے جس کے فیضان سے ذرے اپنے آپ کو چٹان اور قطرے اپنے آپ کو سمندر محسوس کرنے لگ جاتے ہیں۔ محمد علی جناح اس قسم کے (Genius) تھے جن کے حسنِ عمل کے اثر سے مسلمانانِ ہند کا یہ انبوہِ عظیم اور اژدحامِ کثیر اپنے آپ کو ایک قوم کی شکل میں دیکھنے لگ گیا۔ یوں تو قوم، محض افراد ہی کے مجموعہ کا نام ہوتی ہے لیکن افراد کا قوم بننا آسان نہیں ہوتا۔ قوم کیمیا کی اصطلاح میں افراد کا مجموعہ (Mixture) نہیں ہوتی، مرکب (Chemical Compound) ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مرکب کی خصوصیات ان اجزاء کی خصوصیات سے کہیں مختلف ہوتی ہیں جن سے ترکیب پا کر وہ مرکب بنتا ہے۔ ایک خردِ یگانہ (Genius) افراد کو قوم میں منتقل کرنے کے لئے وہی کچھ کرتا ہے جو ایک اولیں ذرہ (First Crystal) شیرہ میں تحلیل شدہ ذراتِ قند کو قوی بنانے کے لئے کرتا ہے۔ اس کا کردار وہ مقناطیس ہوتا ہے جس کے گرد، فولاد کے بکھرے ہوئے ذرات جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ شمع ہوتی ہے جو تمام پروانوں کو، باوجود باہمی رقابت، ایک مرکز کے گرد طواف پر مجبور کر دیتی ہے۔ محمد علی جناح کا یہی مقام تھا۔ ہم چونکہ خود اس ہنگامے میں شریک ہیں اس لئے ہم ان کے اس مقام کی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے، جس طرح آنکھوں کے قریب رکھنے سے کتاب کے الفاظ صحیح طور پر پڑھے نہیں جاتے۔ آنے والا مورخ جب اس انقلابِ عظیم پر نگاہ ڈالے گا جو اس ایک فردِ یگانہ کے والہانہ عشق اور مخلصانہ کردار نے دس سال کے قلیل ترین عرصہ میں رجعت پسند قوموں کی زندگیوں میں جہاں ایک ایک صدی کا ایک ایک دن ہوتا ہے آنکھ جھپکنے سے زیادہ نہیں، متشکل کر دیا تو وہ اس مقامِ رفیع و منیع کی عظمت کو پہچان سکے گا۔ اور چونکہ ہم لے اس انقلاب آفرینی

کی جد و جہد میں کچھ بھی نہیں کیا۔ اس لئے ہمیں اس کی صحیح قدر و قیمت کا بھی احساس نہیں ہو رہا۔ جن قوموں نے اپنے خون کی قیمت دیکر آزادی حاصل کی ہو ان سے پوچھئے کہ اس انقلاب کی قیمت کیا ہے؟ مسلمان جیسی قوم کو جس میں قوت برداشت بھی نہ رہی ہو، ہندو جیسی قوم کی غلامی سے چھڑا دینا، جو اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام اُن سے لینا چاہتی تھی ایک اعجاز ہے۔ حیرت انگیز۔ ایک تغیر ہے معجز نما۔ لیکن معجزہ ہے یہ نقطۂ پختگی کردار کا۔ کرامت ہے یہ صرف حسنِ اخلاص کی۔ اور پھر ان دونوں کے ساتھ سعیٔ پیہم اور عملِ متواتر۔ جب ۱۹۴۰ء میں، قوم نے پاکستان کا ریزولیشن پاس کیا ہے تو قائدِ اعظم نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ میں آج یوں محسوس کرتا ہوں گویا میری زندگی دس سال بڑھ گئی ہے۔ جب پاکستان کا رزولیوشن پاس ہونے پر ان کی قلبی مسرت کی یہ کیفیت تھی تو حصول پاکستان کے بعد تو انہیں فی الواقعہ از سرِ نو جوان ہو جانا چاہیئے تھا۔ وہ یقیناً جوان ہو جاتے کیونکہ کامرانی و کامیابی کی جنت میں سب جوان ہوتے ہیں، بوڑھا کوئی نہیں رہتا۔ لیکن پاکستان کی جوئے شیر ہندو مفسدہ پردازی کا جو تیشۂ فرہاد اپنے ساتھ لائی اس نے اس از سرِ نو جوان ہو جانے والے مردِ کہن سال کو خمیدہ کمر کر دیا۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ سال گزشتہ سے ایک مشتِ استخوان سے زیادہ کچھ نہ رہ گئے تھے اور ملت پر آنے والے صدمات و حوادثات نے ان کے چہرے کی تمام تازگیاں خشک کر دی تھیں۔ حتیٰ کہ آخری ایام تو بالکل موت و زیست کی کشمکش میں گزر رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود عملِ پیہم کی یہ کیفیت تھی، کہ یہ مردِ نحیف و نزار آخری وقت تک تن دہی اور جاں فشانی سے کام کرتا رہا جو اس کی زندگی کا معمول بن چکا تھا۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب کسی کو اپنے مقصود سے عشق پیدا ہو چکا ہو

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ　　　عشق ہے اصلِ حیات۔ موت ہے اس پر حرام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات　　　عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات
رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت　　　معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

اپنے نصب العین کی صداقت پر ایمان اور اس کے حصول کے لئے عشق۔ یہ ہے وہ حرارت جس سے خونِ رگِ کائنات میں تموج اور اس پیکرِ گل میں تب و تاب زندگی کی نمود ہے۔ یہی ہے وہ مقام جہاں خدا کی نصرت، انسانی کوششوں میں رفیق کار بن کر، بلا ساز و یراق، اسے اس طرح رواں دواں جانبِ منزل لے جاتی ہے کہ عقل کا ارہبۂ انگشت بدنداں رہ جاتا ہے کہ یہ ہوا کیسے؟ لیکن جاننے والے جانتے

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

وہ اللہ کا بندہ جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب! اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو! — رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز

عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

اے خوشا وہ پیکر خاکی کہ جسے یہ مقام حاصل ہو جائے اور پھر اس سے بھی کہیں بڑھ کر خوش بختی ہے اکی جس کی سعی و عمل کا ماحصل، اس کی زندگی ہی میں اس کے سامنے آجائے اور باہیں ہمہ کہ آثار و شواہد اور قرائن و نظائر قطعاً اس کی شہادت نہ دیتے ہوں کہ منزل اس قدر قریب اور مقصود ایسا سامنے آچکا ہے۔ ایسے انسان کی موت، ایسی موت ہو جس پر ہزار زندگیاں رشک کریں۔ ایک امریکن خاتون نے تاج محل کو دیکھ کر کہا تھا کہ اگر مجھے یقین دلا دیا جائے کہ مرنے کے بعد مجھے اس مقبرہ میں دفن کر دیا جائے گا تو میں ابھی جان دیدینے کے لئے تیار ہوں۔ تہذیب مغرب کے سامنے چونکہ کائنات کا ظہور اور رموز یہی ہے۔ اس لئے اس خاتون کو خشت و سنگ کے اس پیکر حسین میں وہ جاذبیت نظر آئی جس کی وجہ سے اس نے اپنی زندگی پر موت کو ترجیح دینا پسند کیا لیکن جن کی نگاہیں سطح سے بلند ہو کر مقاصد عالیہ کے حریم قدس تک پہنچتی ہیں وہ اس حقیقت کو محسوس ہی نہیں کرتے، مشہود دیکھ لیتے ہیں کہ اگر انہیں محمل لیلیٰ تک رسائی کا یقین ہو جائے تو ہزار زندگیاں اس موت پر نچھاور کی جاسکتی ہیں۔ اور اصل تو یہ ہے کہ عشق تو اس کی بھی پرواہ نہیں کرتا کہ ناقۂ محمل لیلےٰ تک پہنچتا بھی ہے یا نہیں۔ اس کے نزدیک تو بدنبال محمل بادیہ پیمائی کرنا اور جان دیدینا ہی عیش دوام اور حیات خلد ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر، محمد علی جناح کی موت، ایسی موت نہیں جس پر غم کے آنسو بہائے جائیں۔

لیکن آنسو تو محبت کے پیامبر ہیں، انہیں کون تھامے۔

دل کا خون آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج
نالہ روکا تھا کہ بے پردہ دہ رانہ نہ ہو

مگر یہ آنسو اپنی حد تک ہی تو پیامبر محبت کہلا سکتے ہیں، اس سے آگے بڑھ کر اگر قلوب میں افسردگی، نگاہوں میں پژمردگی، دل میں یاس اور عزائم میں شکست پیدا کر دیں تو یہی آنسو وہ سیلاب بن جاتے ہیں جن میں ان مقاصد کی کشتیاں غرق ہو جاتی ہیں جو مرنے والا اپنی جان دیکر، جینے والوں کے سپرد کر گیا تھا۔ دیکھئے اس باب میں ہمیں قرآن کس مقام بلند پر لیجاتا ہے اور وہ نفوس قدسیہ جن کے نقوش قدم اس

صراط مستقیم کی دلیلِ راہ ہیں جس پر گامزن ہو کر کاروانِ انسانیت کو اپنے مقامِ محمود تک پہنچنا ہے، قرآن کے اس مقام کی کیا تفسیر کرتے ہیں۔ قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں وہ مقاصد کبھی پائیدار نہیں رہ سکتے جن کا قیام شخصیتوں سے وابستہ ہو۔ اشخاص کے لئے ایک نہ ایک دن موت مقدر ہے۔ لہٰذا اگر کوئی عمارت محض کسی شخصیت کے ستون واحد پر استوار ہے تو اس شخص کی موت کے ساتھ ہی وہ عمارت زمین بوس ہو جائیگی قرآن ہمیں یہ درس فلاح دکامرانی دیتا ہے کہ تمہارے مقاصد کا حصول، اشخاص سے نہیں بلکہ نظام سے وابستہ ہونا چاہیئے۔ اشخاص آتے ہیں اور اشخاص جاتے ہیں، لیکن نظام کی جوئے رواں، اپنے زور دروں سے ہردم رواں، ہیہم جواں رہتی ہے۔ لہٰذا تم اشخاص سے ملتفت ہو کر نظام کے استحکام اور استواری کی فکر کرو۔ اگر تمہارا النظام صالح ہے تو اشخاص کا آنا اور جانا تمہارے مقاصد حیات پر اثر انداز نہیں ہو سکتا غور کیجیئے۔ ایک مسلمان کے لئے ذات رسالت مآب سے زیادہ قبلۂ مقصود اور کونسی ہستی ہو سکتی ہے۔ لیکن قرآن نے اس حقیقت کو محکم طور پر نگاہوں کے سامنے لانے کے لئے، کہ تمہارے مقاصد زندگی، تمہارے نظام سے وابستہ ہونے چاہئیں، نہ کہ اشخاص سے، خود ذاتِ رسالت مآب کے متعلق فرمادیا کہ

وما محمد الا رسول، قد خلت من قبله الرسل، افائن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئاً و سیجزی اللہ الشاکرین ۝

محمد بیش ازیں نیست کہ ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول ہو گزرے ہیں پس اگر وہ فوت ہو جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ جو کوئی الٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا (خود اپنا ہی نقصان کرے گا)، اور جو شکر گذار رہے گا تو اللہ انہیں اس کا بدلہ دے گا۔

غور فرمایئے۔ یہ آیۂ جلیلہ کس قدر بلند نصب العین کی حامل ہے۔ اور تو اور، خود ذاتِ رسالت مآب کے متعلق، کہ جن کی نسبت ہمارا ایمان ہے اور دل کی عقیدتوں کے علاوہ نگاہ کی بصیرتوں کے ساتھ ایمان کہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اس ذات اقدس و اعظم کے متعلق بھی ارشاد ہوتا ہے کہ یاد رکھو تمہارے مقاصد کا قیام، محمدؐ کی ذات سے وابستہ نہیں، وہ وابستہ ہے اس نظام سے جو محمد رسول اللہ نے قائم کر دیا ہے۔ اگر اس نظام کو تم نے قائم رکھا تو وہ تمام نعمتیں، جو محمد رسول اللہ کی وساطت سے تمہیں عطا کی گئی تھیں، بدستور ملتی رہیں گی و سیجزی اللہ الشاکرین، اور اگر تم اس نظام کو تہ و بالا کر کے پھر اسی روش زندگی کی طرف لوٹ گئے

جس پر تم اس نظام سے پہلے گامزن تھے تو اس سے خدا کا تو کچھ بگڑے گا نہیں، البتہ تم سے وہ سب کچھ چھن جائے گا جو تمہیں اس نظام کے ثمرات میں سے ملنا تھا۔ لہٰذا تمہاری بقا اور فنا اس نظام کی بقا اور فنا کے ساتھ وابستہ ہے، محمدؐ کی ذات کے ساتھ نہیں۔ یہ تھا وہ رازِ حیاتِ دوام جسے پیروانِ قرآنی پر یوں منکشف کیا گیا۔ اب دیکھئے اس درسِ بلند کی تفسیر کس طرح سے ہوئی۔ نبی اکرمؐ کی وفات صحابہ کبارؓ کے لئے جس قدر الم انگیز اور اندوہناک ہوئی ہوگی اس کا اندازہ ہم شاید ہی لگا سکیں وہ ذاتِ گرامی کہ جسے صرف دیکھ لینے، بلکہ جس کی فقط خیریت معلوم کر لینے سے، ان کی زندگیوں میں شادابی اور روحوں میں تازگی آجاتی تھی جس کی رکاب تھامے انہیں قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج نصیب ہوگئے تھے، جو فی الواقعہ

یتیموں کا مولا غلاموں کا آقا

تھا۔ اس ہستی کی وفات نے ان پر قیامت برپا کر دی ہوگی۔ وفات کی خبر سن کر صحابہؓ کا جو حال ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے۔ لیکن وہ جنہیں آنسوؤں کو اپنی حد تک رکھنے کی تعلیم دی گئی تھی انہیں ان کی حد سے آگے نہیں بڑھنے دے سکتے تھے۔ اس محشرستانِ غم و اندوہ میں حضورؐ کے سب سے زیادہ قریبی، حضرت صدیق اکبرؓ کہ جنہیں اس وفات کا سب سے زیادہ غم ہونا چاہیئے تھا، سرِ منبر تشریف لائے اور دل کے کامل سکون کے ساتھ فرمایا۔

ایھا الناس۔ من کان یعبد محمد فانہ قد مات ومن کان
یعبد اللہ فانہ حی لایموت

لوگو! جو شخص محمدؐ کی عبودیت اختیار کئے تھا وہ جان لے کہ محمدؐ وفات پاگئے۔ لیکن
جس نے اللہ کی عبودیت اختیار کر رکھی تھی تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ خدا ہمیشہ زندہ
ہے کبھی مرنے والا نہیں۔

اس کے بعد آپ نے وہ آیت پڑھی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ لوگوں کی توجہ اصل مقصود کی طرف پھر گئی اور انہوں نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر سب سے پہلا کام اس نظام کو آگے چلانے کا کیا جسے ذاتِ محمد رسول اللہؐ نے متشکل کیا تھا۔

خدا کے اس بندے محمد علی جناح۔ اللہ کی اس پر ہزار ہزار رحمتیں، کی وفات پر یہ آوازیں پاکستان کی سرحد کے اس پار سے بلند ہونی شروع ہو گئی ہیں کہ پاکستان کے مسلمانوں! اب تم اس مسلک کی طرف لوٹ جاؤ جو حصولِ پاکستان سے پہلے ہندوستان کے بتکدوں میں تمہارے لئے تراشا گیا تھا۔ یاد رکھو! جو کوئی اس آواز پر کان دھرے گا، وہ خود اپنا ہی نقصان کرے گا۔ لیکن جو اس نظام کو قائم رکھیگا

رہتے ہیں اور عوام کسی اور جہان میں۔ اسی بُعد و مغائرت کا نتیجہ ہے کہ عوام میں ابھی تک یہ شعور بیدار ہی نہیں ہو سکا کہ اب حکومت ہماری اپنی ہے اور ارباب حل و عقد کے دل میں یہ خیال نہیں گذرا کہ انکا اپنے کردار و عمل کے لئے ان سامنے جواب دہ ہیں۔ اس بیگانگی و غیریت کو آج تک ابھر کر سامنے آنے کا موقعہ اس لئے نہیں ملا کہ ہم میں ایک ایسی ہستی موجود تھی جس کی محبت و عقیدت عوام کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں تھی اور جس پر انہیں کامل [illegible] اس کے فیصلے اگر ذہنی طور پر کسی کی سمجھ میں نہیں بھی آتے تھے تو بھی لوگوں کا دل اس سے مطمئن ہوتا تھا [illegible] کہ انہیں یقین تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے ان کی فلاح و بہبود کے لئے کر رہا ہے حتیٰ کہ اگر وہ خاموش بھی رہتا تھا تو اس کی خاموشی و سکوت میں بھی ایک سکون و اطمینان کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ لیکن ہر [illegible] ہم میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جسے یہ حیثیت حاصل ہو۔ لہٰذا اب پاکستان کا قیام و استحکام [illegible] صورت میں ممکن ہے کہ عوام اور حکام میں قلبی رابطہ پیدا ہو جائے۔ عوام محسوس کرنے لگیں کہ یہ حکومت ہماری اپنی ہے اور اس کے استحکام میں ہمارے اپنے استحکام کا راز مضمر ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ حقیقت ذرا تلخ سی ہے لیکن جو قوم حقائق کو بے نقاب دیکھنے سے چشم پوشی کرتی ہے وہ دنیا میں کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہوگا کہ اب عوام اور حکومت میں وہ ناتا باقی نہیں رہا جو ان کے محبوب [illegible] عقیدت و محبت سے استوار تھا۔ اس لئے اب اس کمی کو اسی صورت میں پورا کیا جا سکتا ہے کہ ارباب اقتدار عوام کے ساتھ رابطۂ اخلاص و یگانگت پیدا کریں۔ آج تو حالت یہ ہے کہ اخلاص و یگانگت تو ایک طرف، نری حکومتوں میں جو نظم و نسق کے روابط ہوتے ہیں وہ بھی ہم میں مفقود ہیں۔ مثال کے طور پر اسی واقعہ کو لیجئے جو پچھلے ہفتہ رونما ہوا۔ محترم قائد اعظم کی وفات کا صدمہ ہی کچھ کم جانگسل نہ تھا کہ اس کے بعد سقوط حیدر آباد کی خبر آگئی اور اس طرح آگئی جیسے کھلے آسمان سے کسی پر بجلی گر پڑے۔ غلط یا صحیح، لوگوں نے حیدر آباد کے مسئلہ کو خود اپنا مسئلہ [illegible] اس کی جنگ کو خود اپنی جنگ سمجھ رکھا تھا۔ حیدر آباد پر یلغار ہوئی تو پاکستان کے مسلمانوں کے دلوں میں اضطراب پیدا ہو گیا کہ وہ معلوم کریں کہ ہماری حکومت کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے۔ کراچی میں یہ اضطراب، جلوسوں اور مظاہروں کی شکل میں منصۂ شہود پر آیا۔ ہو سکتا ہے کہ ارباب حکومت کے لئے رموز سلطنت اس باب میں لب کشائی سے مانع ہوں۔ لیکن عوام کے اطمینان کی اور ہزار شکلیں پیدا کی جا سکتی تھیں۔ لیکن ہماری حکومت کے ایوان پر سکوت کے حریری پردوں میں کہیں کسی جنبش و ارتعاش کے آثار تک دکھائی نہ دیئے۔ حتیٰ کہ تین دن کے بعد یکایک حیدر آباد کے ہبوط کی خبر آگئی۔ اس خبر سے کچھ اس قسم کی بد دلی اور وحشت سی پھیلی کہ اچھے اچھے باہمت لوگ بھی متوحش اور سراسیمہ سے دکھائی دینے لگ گئے۔ جب ان خواص کی یہ حالت تھی تو عوام کی جو کیفیت ہو گی وہ ظاہر ہے۔ فتنہ پردازوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ اور عجیب عجیب قسم کی افواہوں سے فضا کو زہر آلود کرنا شروع کر دیا۔ باہر کا تو ہمیں کچھ زیادہ علم نہیں۔ خود دارالسلطنت کراچی کی یہ حالت تھی کہ افواہیں

نہ مقیں شہد کی مکھیوں کے چھتے چھوڑ گئے تھے۔ کئی دنوں تک یہی کچھ ہوتا رہا لیکن حکومت منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھی تھی حرام جو ایک لفظ بھی ان کی زبان سے نکلا ہو[1]۔ ذرا جنگ کے زمانہ کے لندن کو سامنے لائیے اور پھر دیکھئے کہ حکومت، عوام کے (Morale) کو قائم رکھنے کے لئے کیا کچھ کیا کرتی ہے۔ یہاں اور کچھ نہیں تھا ریڈیو تو موجود تھا۔ پھر اتفاق حسنہ یہ کہ محترم قائد اعظم کی وفات کے ماتم کی وجہ سے چند دنوں کے لئے وہ ان لغویات سے بھی فارغ تھا جو سال بھر طاعون کے چوہوں کی طرح، گھروں کی کوٹھریوں تک میں، قوم کے لئے دشمن ایمان و آگہی اور رہزن ذوق سلیم بنتی رہتی ہیں۔ لیکن اس کی زبان سے بھی، الیسوسی ایٹڈ پریس کی خبروں کے ورد کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔ نتیجہ یہ کہ بلا سبب اور بغیر وجہ، اتنے دن اس قدر خوف و ہراس اور خلفشار و انتشار کی کیفیت رہی۔ دیکھنے والی آنکھیں متعجب تھیں کہ یا اللہ! اگر سچ مچ کا کوئی خطرہ ان کے سامنے آگیا تو اس قوم کی کیا حالت ہوگی! یہ سب کچھ ہوا لیکن ہماری حکومت کی طرف سے اس کے مداوا میں ایک تدبیر بھی تو سامنے نہ آئی۔ ان کے ریڈیو کی زبان گنگ اور ان کے محکمۂ اطلاعات عامہ کی روشنائیاں خشک ہوگئیں۔ اور فتح حیدر آباد کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلمانان پاکستان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "انہیں ہماری طرف سے بدگمانی اور خوف کے جذبات کو دور کر دینا چاہیئے"۔ یہاں ان الفاظ کو سب نے سنا لیکن کسی نے اتنا بھی نہ کہا کہ بدگمانی تو خیر آپ کے اعمال کا لازمی نتیجہ ہے۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ سے خوف کسے ہے جس کی طرف آپ اشارہ فرما رہے ہیں؛ ہاں تو یہ ہے اس فقدان روابط کی ایک مثال جس کا ذکر ہم اوپر کر رہے تھے۔ لہذا جب تک حکومت اور عوام میں، من تو شدم تو من شدی کی کیفیت نہ پیدا ہوگی، جب تک ارباب اقتدار عوام کا اعتماد حاصل نہ کریں گے، جب تک وہ انہیں محسوس نہیں کرائیں گے کہ یہ حکومت خود تمہاری حکومت ہے اور ہم صرف اس امانت کے پاسبان ہیں۔ اس وقت تک دلوں کی دنیا میں سکون پیدا نہیں ہو سکتا اور جب تک دلوں کی بستیاں نہیں بستیں اس وقت تک مملکتوں اور سلطنتوں کے ویرانے آباد نہیں ہو سکتے۔

بہ ملازمان سلطاں خبرے دہم ز رازے
کہ جہاں تواں گرفتن ز نوائے دل نوازے

دوسری طرف ہم عوام سے بھی یہ پوچھتے ہیں کہ بالآخر تمہاری یہ حالت کب تک رہے گی کہ کسی نے ذرا سی بات ہوا میں اڑائی اور تم نے بھاگنا شروع کر دیا۔ تم اب غلامی کے بچپن سے نکل کر، آزادی کے عہد شباب میں پہنچ چکے ہو۔ اب یہ طفلانہ حرکتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں۔ اب تم بھیڑوں کے گلے نہیں ہو کہ

---

[1] سب سے پہلی مرتبہ محترم وزیر اعظم نے ۲۲ ستمبر کی شام کو ایک تقریر نشر کی جس میں ان امور کا ذکر کیا گیا۔

جب تک ایک چوپان تمہارے پیچھے لٹھ لئے نہ چل رہا ہو، تمہیں یہ خوف کھائے جا رہا ہو کہ نہ معلوم کونسا بھیڑیا تمہیں اچک کرلے جائے گا۔ اب تمہاری زمین بدل چکی ہے، تمہارا آسمان بدل چکا ہے۔ لیکن تمہیں کچھ اس کا احساس ہی نہیں ہوا ؎

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی
تم کو لیکن ذرا خبر نہ ہوئی

تمہاری حالت یہ ہے کہ کراچی کے چوراہے میں کوئی خناس ایک رسی چھوڑ دیتا ہے تو تم اسے بندر روڈ تک پہنچتے پہنچتے اژدہا بنا دیتے ہو۔ اور اس کے بعد تم میں وہ بھاگڑ مچتی ہے کہ جس پر غیرت روئے اور حمیت آنسو بہائے۔ تم روز دیکھتے ہو کہ جو افواہیں صبح کو پھیلتی ہیں وہ شام تک غلط ثابت ہو جاتی ہیں۔ لیکن تم دوسری صبح پھر اسی قسم کی افواہوں پر یقین کر لیتے ہو۔ تم بھی ذرا جنگ کے دوران میں لندن پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ متواتر پانچ برس تک اس شہر پر ہر شب بمباری ہوتی رہی۔ ایک نہیں، دو نہیں، دس نہیں، سینکڑوں بمبار جہاز بیک وقت ہلاکت برساتے تھے۔ لیکن کسی ایک دن بھی وہاں وہ ابتری نہ پھیلی جو تمہارے ہاں آتش بازی کا پٹاخہ پھیلا دیتا ہے۔ دنیا میں زندہ رہنے والی قومیں کبھی متوحش دہراساں نہیں ہوتیں یاد رکھو! تمہاری بقا کا راز پاکستان کی بقا میں ہے۔ لیکن پاکستان کی بقا کا راز خود تمہاری ہمت اور حوصلوں میں مضمر ہے۔ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ تم اس قدر خائف اور لرزاں کیوں ہو جاتے ہو۔ اس لئے کہ تمہارا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کوئی قلبی تعلق نہیں پیدا ہوا۔ تم میں نفسا نفسی کا عالم ہے جو افراتفری کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ایک ایک کر کے دس آدمی بھی کہیں جائیں تو وہ خوف کھائیں گے۔ لیکن اکٹھے اگر دو بھی ہم سفر ہوں تو انہیں کبھی ڈر محسوس نہیں ہوگا۔ تم یہاں کروڑوں کی تعداد میں تو ہو لیکن سب الگ الگ ہو۔ قرآن اسی چیز کو خوف کا باعث قرار دیتا ہے۔ سورۂ حشر میں دیکھئے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ کفار کے دل میں تمہارا (مومنین) کا ڈر، خدا کے ڈر سے بھی زیادہ ہے اور وہ تمہارے سامنے آنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تحسبھم جمیعًا و قلوبھم شتّٰی۔ تو انہیں اکٹھا سمجھتا ہے حالانکہ وہ صرف دیکھنے میں اکٹھے ہیں۔ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ ہیں" ہم بھی یہاں بظاہر اکٹھے نظر آتے ہیں۔ لیکن ہمارے دل ایک دوسرے کے قریب نہیں ہیں۔ اور جب تک کسی قوم کے افراد کے قلوب ایک دوسرے سے قریب نہ ہوں اس قوم سے خوف و حزن دور نہیں ہو سکتا اور قلوب کی ہم آہنگی وحدت مقصد سے پیدا ہوتی ہے۔ تم دیکھتے نہیں کہ فٹبال کی ٹیم کے کھلاڑی میدان میں مختلف مقامات پر متعین ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے سامنے نصب العین ایک ہی ہوتا ہے اس لئے وہ ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہونے کے باوجود ایک ہی بات سوچتے اور ایک ہی کام کرتے ہیں

ان کی نگاہوں کا مقصود ایک اور ان کے حرکت کی سمت واحد ہوتی ہے۔ ہم پاکستان میں تو آبیٹھے ہیں لیکن ہمارے دلوں میں وحدت مقصد کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس مقصد سے ہم سب کی حفاظت و صیانت وابستہ ہے۔ نہیں، بلکہ ہماری زندگی اور موت کا سوال اسی کی طاقت اور کمزوری سے متمسک ہے۔ جب ہم میں سے ہر ایک کے دل میں استحکام پاکستان کا مقصد وحید نمایاں جگہ حاصل کرے گا تو اس وحدت مقصد سے ہم میں قلبی اتحاد یعنی ائتلاف پیدا ہو جائے گا۔ اور اس کا فطری نتیجہ خوف دہراس سے مامونیت ہوگا۔ اور پھر استحکام پاکستان سے ہمارا مقصود صرف ایک حکومت قائم کرنا نہیں بلکہ دنیا کے غیر فطری آئین وغیر آئینی استبداد کی ستائی ہوئی خلق خدا کے لئے امن وسلامتی کی راہیں کھولنا ہے۔ جب قوم کے سامنے ایسا بلند مقصد آجائے تو پھر وہ کسی کی قوت وحشمت اور ساز وبراق سے خائف نہیں ہوتی۔ بلکہ دوسروں کی تیاریاں ان میں عزم واستقلال کی قوتوں کو اور زیادہ محکم کر دیتی ہیں۔ یہی ہیں وہ لوگ جن کے متعلق فرمایا ہے کہ الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان سے اور لوگوں نے کہا کہ تم سے جنگ کرنے کے لئے دشمن نے بڑی قوت فراہم کر رکھی ہے اس لئے تم ان سے ڈرو" تو بجائے اس کے کہ اس خبر سے ان کے حوصلے پست ہو جاتے۔ ان کا ایمان اور زیادہ مضبوط ہو گیا (فزادھم ایمانا) اور وہ بے خوف وخطر پکار اٹھے حسبنا اللہ ونعم الوکیل ہمارے لئے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے اور جس کا کارساز اللہ ہو تو کیا ہی اچھا کارساز ہے: پس جہاں ارباب اقتدار کا یہ فریضہ ہے کہ وہ پاکستان کے استحکام کے لئے پوری پوری عسکری تیاری کریں، کہ دشمنوں کے ... ... دلوں میں رعب قائم رکھنے کا یہی ذریعہ قرآن نے بتایا ہے۔ جب فرمایا کہ واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم" جو کچھ قوت اور سامان اور گھوڑوں کے سرحدات پر باندھنے سے تم کرسکو، اسے ضرور تیار رکھو تاکہ اس سے تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کے دلوں کو خوف زدہ رکھ سکو" اور ان سے کہہ سکو کہ ولا یحسبن الذین کفروا سبقوا انھم لا یعجزون تم اس زعم باطل میں مبتلا نہ رہو کہ تم ہم سے آگے نکل گئے ہو ہرگز نہیں۔ تم ہمیں کبھی مغلوب نہیں کرسکتے" اس کے ساتھ ہی عوام کا یہ فریضہ ہے کہ سکون خاطر اور جمعیت قلب سے اپنے اندر استقلال واستقامت پیدا کریں۔ اور استحکام پاکستان کی وحدت مقصد سے اپنے دلوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لاتے جائیں۔ تاکہ خارجی قوتوں اور ان کی طاقتوں سے ہم نہ صرف اپنی حفاظت کا سامان ہی فراہم کرلیں بلکہ اس دنیا پر بسنے والی خلق خدا کے لئے بھی امن وسلامتی کا ذریعہ بن جائیں۔

یہی قائد اعظم کی بہترین یادگار ہے جو تم قائم کرسکتے ہو۔

دوسری بات جو ہم اپنے ارباب حل وعقد کی خدمت میں گزارش کرنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ اب آپ اس سرزمین کو زیادہ عرصہ تک بے آئین نہ رہنے دیں۔ آئین خواہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ بہرنوع بے آئینی سے بہتر ہوتا ہے کہ غلط آئین کو آئینی طور پر صحیح کیا جاسکتا ہے۔ لیکن بے آئینی میں کوئی آئین چل ہی نہیں سکتا۔ اب جبکہ یہ ملک ہمارا ہے تو اس میں آئین بھی ہمارا اپنا ہونا چاہیئے۔ محترم قائد اعظم کی زندگی میں بات کچھ اور تھی۔ لوگ ان کے فیصلوں کو بطور آئین تسلیم کرلیتے تھے اور وہ اگر کسی "کھمبے" کو بھی صاحب اختیار متعین کردیتے تھے تو لوگ اسے بھی اپنا نمائندہ تسلیم کرلیا کرتے تھے۔ بایں ہمہ اپنے آئین کی ضرورت اس وقت بھی مسلم تھی۔ اور وہ ضرورت اب بالکل ناگزیر ہوگئی ہے۔ اس باب میں جو خدشات آپ کے سامنے ہیں ان کا ہمیں احساس ہے۔ لیکن اگر ان خدشات کا یہ علاج سوچا جائے کہ آئین سازی کو علی التواتر ملتوی کرتے چلے جائیں تو یہ تو کوئی حل نہیں ہوگا ضرورت ہے کہ ان خدشات کا کھلے طور پر سامنا کیا جائے اور ان کا مؤثر حل تجویز کیا جائے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ جب یہاں "نظام شریعت" کا نام لیا جاتا ہے تو آپ میں سے اکثر اس سے کپکپا اٹھتے ہیں۔ یہ کپکپی قابل فہم ہے۔ اس لئے کہ جس قسم کے "نظام شریعت" کا تصور ہمارے دلوں میں پیدا ہوچکا ہے۔ وہ فی الواقعی ایسا ہے کہ اس سے اپنوں اور بیگانوں، دونوں کے دلوں میں کپکپی پیدا ہوجائے۔ ہم اس وقت ان اسباب و علل سے بحث نہیں کرنا چاہتے جن کی وجہ سے اس نظام کے متعلق اس قسم کا تصور ہمارے قلوب واذہان میں پیدا ہوچکا ہے۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ جس نظام کا یہ تصور ہے وہ نظام ہی اسلامی نہیں۔ اگر اسی ایک سال میں ہم اپنے طور پر صحیح اسلامی نظام کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور اس کے بعد اسے دوسروں کو بھی سمجھاتے تو ہمیں پورا یقین ہے کہ اس سے نہ صرف ہمارے دلوں میں اس کی طرف سے جذبات احترام واطمینان پیدا ہوجاتے بلکہ دوسروں کی طرف سے بھی اس کی ترویج کے تقاضے آنے شروع ہوجاتے۔ اس لئے کہ اگر وہ نظام (جیسا کہ ہمارا دعویٰ ہے) فطرت انسانی کے تقاضوں کی صحیح تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے تو ممکن ہی نہیں کہ اسے اس کی اصل شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور انسانیت اس سے اِبا کرے۔ کیا تاریخ آپ کو اس قسم کے واقعات نہیں بتاتی کہ جب مسلمانوں کی فوج حمص کو خالی کرکے جانے لگی ہے تو وہاں کی عیسائی آبادی روتی تھی اور ان کی منتیں کرتی تھی کہ خدا کے لئے تم یہاں سے نہ جاؤ۔ تم چلے جاؤ گے تو ہمیں پھر عیسائیوں کے نظام حکومت کے ماتحت آنا پڑے گا۔ یہ تھی اس نظامِ صحیح کی کشش اور اس کے چلانے والوں کی سیرت کی جاذبیت کہ عیسائی آبادی، عیسائیوں کی حکومت کے مقابلہ میں مسلمانوں کی حکومت کو اپنے لئے مایۂ زندگی سمجھتی تھی۔ آپ مجلس قانون ساز کی کسی جماعت منتخبہ سے اتنا تو کہئے کہ وہ قرآن جاننے والوں سے اس نظام کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کے بعد بتائیں کہ کیا یہ نظام فی الواقعہ قابل عمل ہے یا نہیں۔ اور پھر دوسروں سے پوچھیں کہ اس قسم کے نظام کے خلاف انہیں کیا

اعتراض ہے۔ باقی رہا اس نظام کی تدوین میں باہمی اختلافات کا خدشہ، سو جیسا کہ ہم کئی بار عرض کر چکے ہیں، قرآن پر تمام مسلمانوں کو اتفاق ہے۔ آپ اپنے مجوزہ آئین کو قرآنی نظام کہہ کر پکاریں اور یہ شرط عائد کر دیں کہ اس آئین کی کوئی جزئیات ایسی نہیں ہونی چاہئیں جو قرآن کی اصل سے ٹکرائیں۔ آپ دیکھئے گے کہ اس طرح ایک متفقہ علیہ ضابطہ قوانین کی ترتیب کا کام کس طرح آسان ہو جاتا ہے۔ یہ نظام تدریجاً مرتب ہوگا۔ اور تدریجاً ہی نفاذ پذیر۔ لیکن اسے بطور اصول تسلیم کرنے کے لئے آپ اسے سمجھنے کی کوشش تو کریں۔

اس کے ساتھ ہی ہم ایک گذارش عوام سے بھی کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھئے کہ شریعت کے کتنے ایسے کام ہیں جو نظامِ شریعت کے آئینی طور پر نافذ ہونے سے پہلے بھی آپ شروع کر سکتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ انہیں شروع نہیں کرتے اور انہیں نظامِ شریعت تک ٹالے ہوئے ہیں؟ کیا یہ ہمارے "من کا چور" نہیں جو ہمیں اس طرح مقدس فریب میں رکھے ہوئے ہے! کیا سچ بولنے کے لئے بھی کسی قانون ساز اسمبلی کے رسمی آئین کی ضرورت ہے؟ کیا باہمی معاملات میں صفائی اور راست بازی کے لئے بھی کسی ضابطۂ تعزیرات کی حاجت ہے!! کیا شراب اسی صورت میں چھوڑی جا سکتی ہے جب اس کے پینے پر جیل جانے کا خوف حق ہو! کیا رشوت، بددیانتی، بے انصافی، بدمعاملگی، بدعہدی۔ اسی وقت ترک کی جا سکتی ہے جب انہیں قانونی جرم قرار دیا جائے؟ یاد رکھئے جو ان چیزوں کو آج نہیں چھوڑ سکتا، ان کے جرم قرار دیئے جانے کے بعد بھی وہ اسی فکر میں رہے گا کہ قانون کے شکنجہ سے نکلنے کے لئے کونسی راہ اختیار کی جائے! آپ کس بات کے منتظر ہیں؟ نظامِ شریعت کی ان مدات کو کیوں از خود اختیار نہیں کر لیتے؟ آپ کو انہیں اختیار کرتے جائیے۔ پھر اس کے بعد جب یہ نظام آئینی شکل اختیار کر لیگا تو وہ تمہیں ان سرکش قوتوں اور خبیث روحوں کی نقصان دہی سے محفوظ و مصئون رکھنے کی تدابیر فراہم کر دے گا جو کسی معاشرہ میں اس قسم کے حیات بخش قوانین کو رائج نہیں ہونے دینا چاہتے۔ اس لئے تمہارا کام یہ ہے کہ قوموا للّٰہ مثنیٰ و فرادیٰ ثم تتفکروا۔ تم اللہ کی راہ میں ایک ایک دو دو کر کے ہی کھڑے ہو جاؤ۔ اور پھر سوچو کہ تمہیں خود کیا کرنا ہے۔

یہ ہے وہ تبدیلی جس سے تم اس نظام کے قیام کی ابتدا کرو گے جس کی تنفیذ کے لئے پاکستان کا قیام عمل میں آیا ہے اور جو تمہارے محبوب قائدِ اعظم کی زندہ جاوید یادگار بن سکتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھئے کہ جب تک آئین نو مرتب اور نافذ نہ ہو، آئین کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش نہ کرو۔ حکومت کا نظام تمہارے معیار کے مطابق ناقص اور مقابل اصلاح ہی کیوں نہ ہو، لیکن بدنظمی سے ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔ نظامِ حکومت کی اصلاح کی کوشش کرو، اسے بدنظمی اور فوضویت (Anarchy) میں تبدیل کرنے کی سعی نہ کرو۔ یاد رکھو۔ اچھی یا بری، جیسی بھی ہے تمہاری اپنی حکومت، پٹیل اور نہرو کی حکومت سے

بہتر ہے۔ اگر تم نے اس کی تخریب شروع کردی تو اس کا نتیجہ خود پاکستان کی تخریب ہوگا۔ جس کا فائدہ پاکستان کے وہ ازلی دشمن اٹھائیں گے جو شروع سے اس کی گھات میں بیٹھے ہیں۔ یاد رکھو! پاکستان تمہارے خدا کی امانت اور محترم قائداعظم کی محبوب ترین یادگار ہے۔ کچھ ایسا نہ کر بیٹھو جس سے اسے کسی طرح کا نقصان پہنچ جائے۔ یہ سلامت ہے تو تم بھی سلامت ہو۔ مقصود اصلاح ہونی چاہیئے نہ کہ تخریب۔ یہ عزم و احتیاط عام حالات میں بھی کچھ کم ضروری نہیں ہوتی۔ لیکن جن واقعات و حوادث سے ہم اس وقت دوچار ہو رہے ہیں ان کے پیش نظر یہ احتیاط از بس ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ہمیں ہندوستان کے عزائم کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیئے۔ ہندو کبھی ہمارا دوست نہیں ہو سکتا۔ یہ ہمارا فیصلہ نہیں، اس خدا کا فیصلہ ہے جس نے ایمان اور کفر کے امتیاز کو اس طرح نکھار کر سامنے رکھدیا ہے کہ کسی کو ان کی خصوصیات میں شبہ کا امکان بھی نہ ہو۔ ان الکافرین کانوا لکم عدوا مبینا (۴:۱۰۱) "یقیناً کفار تمہارے کھلے کھلے دشمن ہیں" تمہارے خدا کا ارشاد ہے۔ لا یالونکم خبالا (وہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے) ودوا ما عنتم (ان کی انتہائی تمنا یہ ہے کہ تم سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ) قد بدت البغضاء من افواھھم (بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کی زبان پر آجاتی ہیں) وما تخفی صدورھم اکبر (لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے)۔ اگر ان کھلی ہوئی تنبیہات کے باوجود تم ان کے متعلق کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو تو یہ خدا کے ارشاد کو جھٹلانا ہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ صبح شام، اٹھتے بیٹھتے قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے ہیں کہ ہم امن دوست ہیں۔ پاکستان کے خلاف ہمارا کوئی برا ارادہ نہیں۔ حتیٰ کہ ابوالکلام صاحب آزاد، جامع مسجد دہلی میں، خدا کو حاضر ناظر کہکر اعلان فرماتے ہیں کہ ہندوؤں نے اس وقت تک کوئی حرکت ایسی نہیں کی جس سے انہیں خدا اور انسانوں کے سامنے شرمانا پڑے۔ لیکن یہ وہی ہندو ہیں جن کے متعلق انہی ابوالکلام صاحب کا کبھی فتویٰ ہوتا تھا کہ

> یہ کفار واقعات کو جھٹلاتے ہیں۔ حقیقت حال کو جھٹلاتے ہیں۔ اصلیت کو چھپاتے ہیں ماجرائے وقوع کو غلط بتلاتے ہیں۔ نقض امن کرتے ہیں اور پھر اس کو حفظ امن کا لباس پہناتے ہیں۔ قتل کرتے ہیں اور اسے جان بخشی دکھاتے ہیں۔ بات کچھ اور ہوتی ہے مگر اپنی بات کی پچ میں جمہور (ریپبلک) کو کچھ اور جتاتے ہیں..... کفار کے عہد و پیمان کا ہیں بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ آبرو باختہ ہیں۔ عزت نفس و شرف کا انہیں لحاظ تک نہیں۔ قسمیں کھاتے ہیں حلف اٹھاتے ہیں، کہ یہ وعدہ استوار ہے۔ اس میں دوام و استمرار ہے یہ عہد محکم ہے۔ یہ قول و قرار قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان سے سب کچھ کہتے ہیں مگر ہاتھ سے کام لینے کے وقت کچھ یاد نہیں رکھتے ..... خبردار! یہ قسمیں کھانے والے ذلیل النفس

ہیں ان کے حلف پر نہ جانا...... (الہلال ۱۲ ش ۱۹۲۶)

لہٰذا اس فطرت کے پیکر، ہندوؤں کی بات کا یقین کر لینا اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا رکھنا ہے۔ اور پھر بعض باتیں تو ان کی زبان سے صاف صاف نکل جاتی ہیں۔ ابھی پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۰ر اکتوبر کی شام کو ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ کشمیر کی سرحد میں پاکستانی افواج کی موجودگی، ہندوستان کے خلاف کھلی ہوئی لڑائی ہے جسے ہم کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس مسئلہ کو اپنی خوئے بد کے لئے ضرور حجت بنائیں گے۔ اس لئے مسلمانوں کو اس باب میں بغیر کسی قسم کے مغالطہ یا خوش فہمی سے سوچنا چاہیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کو اس کی قوت کے نشہ نے پاکستان کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ لیکن پاکستان کا مسلمان بھی اپنے متعلق کچھ کم غلط فہمیوں سے مسحور نہیں۔ مسلمان اس خوش فہمی میں ہے کہ اس کے پاس ایمان کی قوت ہے اور کوئی دنیاوی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ایمان اتنی بڑی دولت ہے اور کوئی دنیاوی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن وہی ایمان جو عمل و جہاد کو مستلزم ہو جب ایمان بے عمل کا ہم نمونہ بنے بیٹھے ہیں ایسا ایمان نہیں جو فتح و ظفر کا ضامن ہوتا ہے۔ اس قسم کا ایمان مشرقی پنجاب کے ایک ایک مسلمان گھرانے میں سوا ہو چکا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ پھر بھی اس لفظی ایمان پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ہمیں بھولنا نہیں چاہیئے کہ حیدر آباد میں رضاکاروں کا یہی ایمان (بلا قوت) ہندوستان کے ٹینکوں کی یلغار کو روکنے سے قاصر رہ چکا ہے۔ ہم پھر دہراتے ہیں کہ ایمان بڑی طاقت ہے اور ہمارا امتیاز۔ لیکن اگر خالی ایمان ہی دشمنوں کے مقابلہ کے لئے کافی ہوتا تو قرآن میں گھوڑوں کے رسالوں اور عساکر و جنود کی تیاریوں کا حکم نہ دیا جاتا۔ نہ ہی رسول اللہ شمشیر بدست میدان جنگ میں نبرد آزما ہوتے۔ اس لئے ہمیں ان جذباتی نعروں کے فریب میں نہیں رہنا چاہیئے۔ قومیں جب عمل سے بیگانہ ہو جاتی ہیں اور حقائق کا سامنا کرنے سے اغماض برتتی ہیں تو اس قسم کے سہارے ڈھونڈتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں ان لفظی بحثوں سے آگے بڑھ کر کچھ عملی اقدام بھی کرنا ہوگا۔ حکومت کو اسلحہ خریدنا اور تیار کرنا ہوگا جس کے لئے قوم کو روپیہ فراہم کرنا پڑے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی قوم کو بلند حوصلگی اور ثبات و استقلال بھی اپنے اندر پیدا کرنا ہوگا۔ یاد رکھو! ہمیں نہ انگریز کی حمایت پر بھروسہ رکھنا چاہیئے، نہ ہندو کے قول و قرار پر بھروسہ رکھنا چاہیئے صرف اپنی قوت بازو اور اس کے ساتھ خدا کی نصرت پر۔

جہاد زندگی میں ہیں یہی مردوں کی شمشیریں

نظامِ شریعت کی بنیاد

پرویز

میں نے اپنے مضمون "اسلامی نظام" اور اس کے متعلقات میں اس حقیقت سے بحث کی تھی کہ اسلامی ضابطۂ قانون کی تدوین کس طرح سے عمل میں آئیگی۔ ضمناً اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ یہ نظام اپنے صحیح نتائج مرتب نہیں کر سکتا جب تک اسے چلانے اور اس پر چلنے والے اپنے اندر وہ تبدیلی پیدا نہ کرلیں جو اس نظام کی حقیقی روح ہے۔ یہ ضمنی اشارہ مزید وضاحت کا محتاج ہے جو اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس اہم نکتہ کی تشریح و تبئین کسی ایک مقالہ میں نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ جو نقطہ اسلامی نظام کی اصل الاصول ہو، اس کی تفسیر و تصریح ناممکن ہے جب تک انسانی زندگی کے مختلف گوشوں اور نظامہائے عالم کے متنوع شعبوں کو سامنے نہ لایا جائے۔ اس قسم کی سیر حاصل بحث کا مقام میری مستقل تصنیف معارف القرآن ہے۔ اس لئے زیرِ نظر عنوان میں اس موضوع کے صرف عمود سے بحث کی جا سکے گی۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

دنیا میں جس قدر سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، تمدنی، قومی یا بین الاقوامی قوانین اس وقت رائج ہیں ان میں بہرحال اچھی باتیں بھی ہیں۔ مثلاً وہ امور جنہیں دنیا عام طور پر اخلاق حسنہ سے تعبیر کرتی ہے، ان کی تاکید اور ان سے متضاد امور سے اجتناب کی تنبیہ ہر ضابطۂ قانون میں موجود ہے۔ وہ کونسا قانون ہے جس میں جھوٹ کی تعریف کی گئی ہے یا چوری کو جرم نہیں قرار دیا گیا؟ وہ کونسا ضابطہ ہے جس میں رہزنی کو مستحسن اور ایذا رسانی کو محمود ٹھہرایا گیا ہے؟ لیکن اس کے باوجود ان قوانین کے بنانے والے، انہیں چلانے والے، اور جن کے لئے انہیں وضع کیا گیا ہے وہ سب، ان جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں اور بے محابا مرتکب ہوتے ہیں۔ ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ مغرب کی قومیت پرستی، اپنے سے غیر قوم کے ساتھ معاملات میں، جھوٹ اور فریب کو (عملاً) معیوب قرار نہیں دیتی لیکن ایک قوم کے افراد کے باہمی معاملات میں بھی تو ان مذموم افعال سے اجتناب نہیں برتا جاتا! ادھر قانون بنتا ہے اور ادھر دماغ اس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ اصطلاحی طور پر اس قانون کی گرفت سے بچنے کے لئے کیا راہِ عمل اختیار کی جائے۔ قانون پر عمل اسی حد تک ہوتا ہے جہاں تک اس سے بچنے کی صورت ہنوز سمجھ میں نہ آئی ہو۔ حتیٰ کہ واضح اور غیر منسوخ قانون کی اطاعت بھی اسی وقت ہوتی ہے جب یہ معلوم ہو کہ کوئی نگۂ احتساب مواخذہ کے لئے موجود ہے۔ جس چوراہے پر سپاہی نہ کھڑا ہو، وہاں ٹریفک کے قانون کا بہت کم خیال رکھا

جاتا ہے۔ یہ سوال متقنین اور سیاسئین کے لئے ہمیشہ وجۂ کاوش رہا ہے کہ افرادِ قوم سے قانون پر کس طرح عمل کرایا جائے۔ قانون ہمیشہ اجتماعی مصالح کو سامنے رکھکر وضع کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے بعض اوقات افراد اس میں اپنے ذاتی نقصان کا شائبہ دیکھتے ہیں۔ متقنین اور مصلحین انھیں فرد اور جماعت کا باہمی تعلق سمجھاتے اور جماعتی مفاد کی خاطر، انفرادی قربانیوں کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس باب میں، بحالتِ جنگ ایک قوم کو دوسری قوم کے مقابل کھڑا کردینے میں تو کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن بصورتِ امن، افرادِ قوم میں ایثار و قربانی کا جذبہ ابھارنا یا انھیں ان قوانین پر چلانا جن میں وہ اپنا ذاتی مفاد دیکھتے ہوں، مشکل ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ انھیں اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں۔ لیکن بغور دیکھئے کہ مغربی تہذیب کے نقطۂ نگاہ سے اخلاق کی بنیاد کیا ہے؟ ہربرٹ اسپنسر کے الفاظ میں "اخلاق کی بنیاد خوفِ انتقام ہے"۔ یعنی میں چوری اسلئے نہیں کرتا کہ میں ڈرتا ہوں کہ دوسرا شخص میری چیزوں کو چرالے گا۔ میں دوسرے کو ایذا نہیں پہنچاتا کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ اس طرح میں بھی ایذا سے مامون نہیں رہ سکتا۔ میں فریب دہی کو اس لئے معیوب قرار دیتا ہوں کہ لوگ مجھے فریب نہ دیں۔ آپ جوں جوں غور کرتے جائیں گے یہ حقیقت آپ پر منکشف ہوتی جائے گی کہ اس نظامِ حیات میں جس کا دائرہ، انسان کی طبیعی زندگی کے ساتھ ختم ہو جاتا ہو، اخلاق کا جذبہ محرکہ اس کے سوا اور ہو کیا سکتا ہے! اس تہذیب میں اخلاق بھی از قبیل بیع و شریٰ ہو جاتا ہے۔ یعنی میں قیمت اس لئے ادا کرتا ہوں کہ مجھے شئے مطلوبہ مل جائے۔ اگر مجھے وہ شئے بلاقیمت مل جائے اور مجھے اس کا بھی یقین ہو جائے کہ اس طرح کوئی دوسرا میری کوئی چیز بلاقیمت نہیں لے جائے گا تو میرے لئے قیمت ادا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ مغرب کے اربابِ دانش و بینش، آج اس تہذیب کے نتائج سے اس درجہ نالاں اور اپنی اقوام کے مستقبل سے اس قدر ناامید اور پرخوف ہیں کہ وہ اخلاقی اقدار کی پابندیوں کے لئے چلا رہے ہیں لیکن ان کی کوئی سنتا ہی نہیں۔ آپ (British Association for the advancement of science...) کے سالانہ اجلاس کے مختلف پریذیڈنٹوں کے خطبات صدارت کو دیکھئے۔ ان میں ایک پکار بکار کر کہہ رہا ہے کہ ہم نے سائنس کی بلاحدود و قیود ترقیوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی ترقی نہیں کی اس لئے ہم تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ جنرل سمٹس نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا۔

> "نوعِ انسانی کے سامنے سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ سائنس کی ترقیوں کو اخلاقی اقدار کے ساتھ منسلک کرے اور اس طرح ان مہیب خطرات کو دور کرے جو ہمارے مستقبل کیلئے مہلک ہیں"۔

اور سرالفریڈ ایونگ نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں دہرایا ہے۔

> "تسخیرِ فطرت کے بعد اس کی باگ ڈور اس انسان کے ہاتھ میں آگئی ہے جس نے اپنے آپ کو مسخر کرنا نہیں سیکھا"۔

(Karl Mannheim) نے "عصرِ حاضر کی تشخیص" کے عنوان سے ایک دلچسپ اور حقیقت کشا کتاب لکھی ہے

جس میں وہ رقص طراز ہے کہ ان تمام ترقیوں سے کیا حاصل ہے جب ہم یہ نہیں جانتے کہ بالآخر یہ سب کچھ ہے کس مقصد کی خاطر؟ یہ تمام سلسلۂ تعلیم و تربیت بیکار ہے جب تک ہمارے سامنے کوئی (مستقل) اقدار و معیار نہیں۔ ان لوگوں کی نگہ دور رس اپنے خوفناک انجام کو صاف صاف دیکھ رہی ہے اور اسی انجام کے پیشِ نظر وہ اپنی قوم سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ تمہارا علاج اخلاقی اقدار کی پابندی میں ہے لیکن، جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، ان کی کوئی نہیں سنتا۔ یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ ان اقوام کے نزدیک اخلاق کا جذبہ خوفِ انتقام کے سوا اور کچھ نہیں۔ جب وہ اپنے آپ کو انتقام کے خوف سے بے خطر سمجھ لیں تو پھر وہ کونسا جذبہ ہے جو انہیں اخلاقی اقدار کی پابندی پر مجبور کر سکتا ہے۔ اس لئے ان معلمینِ اخلاق کی چیخ پکار سب بے نتیجہ رہ جاتی ہے۔

قرآن آئین و قانون کی پابندی سکھانے کے لئے آیا ہے۔ وہ خود ضابطۂ آئینِ حیات ہے جس کی پابندی تمام نوعِ انسان کے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ ان قوانین و احکام کی پابندی کراتا کس طرح سے ہے! قانون کی پابندی کا نام عمل ہے۔ عمل، بلا حرکت محال ہے۔ اور حرکت، بلا جہت ناممکن۔ حرکت کیلئے جہت (Direction) لاینفک ہے۔ ہر حرکت کسی نہ کسی جہت میں ہوگی۔ لہٰذا عمل کے لئے جہت کا تعین نہایت ضروری ہے۔ اسی کو مقصد یا منزل کہتے ہیں۔ قرآن نے انسانی زندگی کے لئے ایک منزل (یعنی اس کی حرکت کے لئے ایک جہت) متعین کی ہے۔ اس منزل کی وحدت اور صداقت پر یقین، ایمان کہلاتا ہے۔ یعنی یہ کہ تمام نوعِ انسانی کے لئے منزلِ حیات ایک ہے اور وہی حقیقی اور سچی منزل ہے۔ اس کے علاوہ کوئی منزل نہیں جہاں اسے آخرالامر پہنچنا ہے۔ اس منزل تک پہنچانے کی ایک ہی راہ ہے۔ اس کے علاوہ ہر راہ، بربادی اور ہلاکت کی راہ ہے۔ اس راہ (صراطِ مستقیم) پر چلنے سے انسان، ہلاکت اور بربادی کے خوف سے بے خطر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا سفرِ حیات میں اسے ہر وقت یہ خیال رکھنا ہوگا کہ اس کا کوئی قدم غلط راستہ کی طرف تو نہیں اٹھ رہا۔ چونکہ انسان کا ہر قدم ارادہ کے ماتحت اٹھتا ہے اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ انسانی ارادہ کا سرچشمہ اس حقیقت کو ہر وقت اپنے پیشِ نظر رکھے کہ کوئی قدم غلط جہت کی طرف اٹھنے نہ پائے۔ "انسانی ارادہ کے سرچشمہ" کا نام قرآن کی اصطلاح میں قلب ہے اور وہ قلب کی اس کیفیت کو جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، تقویٰ کے جامع لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ لفظ اپنے اندر ایسی جامعیت اور خصوصیت رکھتا ہے کہ دنیا کی کسی اور زبان میں اس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کیفیتِ قلبی کو الفاظ کے ذریعے سمجھانا بھی مشکل ہے۔ لفظی طور پر اتقا، وقی یقی سے باب افتعال ہے۔ اور وقایہ کے معنی ہیں کسی چیز کی اُس چیز سے حفاظت کرنا جو اس کے لئے ضرررساں ہو۔ اسلئے تقویٰ کے معنی ہیں اس چیز سے جس کا خوف کیا جائے اپنی حفاظت کرنا۔ اسی بنا پر بعض اوقات اس کے معنی خوف بھی لئے جاتے ہیں۔ "حفاظت کرنے" یا "بچانے" کے معنوں میں اس کا استعمال، قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر ہوا ہے۔ مثلاً "یا ایھا الذین اٰمنوا قوا انفسکم و اھلیکم نارا" (۶۶/۶ نیز دیکھئے ۲۰/۲۱، ۴۰/۹)

و ...) اتقوا اللہ کے معنی عام طور پر "خدا سے ڈرو" کئے جاتے ہیں اور متقی کے معنی "خدا سے ڈرنے والا" لیکن یہ ظاہر ہے کہ خدا ایسی ہستی نہیں ہے جس سے ڈرا جائے. اس لئے "خدا سے ڈرنے" کا مفہوم اس کے عام مفہوم سے جداگانہ اور گہرا ہے۔ خدا پر صحیح ایمان سے مفہوم مکافاتِ عمل کا صحیح عقیدہ ہے. یعنی یہ ایمان کہ انسان کا کوئی عمل بلانتیجہ نہیں رہ سکتا. اور چونکہ غلط اعمال کے تباہ کن نتائج فی الواقعہ ڈرنے کی چیز ہیں اسلئے ان اعمال کے نتائج کو اللہ کی گرفت (ان بطش ربك لشديد) اور اس خوف کو اللہ کے خوف سے تعبیر کیا جاتا ہے. اس خوف سے مامونیت کا راز یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کی حفاظت میں لے آئے.

مندرجہ بالا مقدمات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ

(۱) قرآن، انسانی حرکت و عمل کا مدار تقویٰ پر قرار دیتا ہے۔

(۲) تقویٰ سے مفہوم یہ ہے کہ انسان، غلط اعمال کے ہلاک نتائج سے خائف ہو اور

(۳) اس خوف سے مامونیت کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کی حفاظت میں لے آئے.

اسی سے مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے تمام معاملات میں ہمیشہ خدا کو سامنے رکھے. یہ ہے اخلاق کا محور. یہ ہے نظامِ شریعت کی بنیاد. یہ ہے متقین کی خصوصیت. الذین یظنون انھم ملاقوا ربھم وانھم الیہ راجعون (۲/۴۶) "جو لوگ اس حقیقت نفس الامری پر یقین رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور بالآخر اسی کی طرف لوٹنا ہے" اور یہی وہ ایمان ہے جس کی بنا پر وہ ہر وقت اس امر کا خیال رکھتے ہیں کہ کہیں کسی وقت اور کسی حالت میں بھی قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے. سورۂ بقرہ میں روزہ سے متعلق احکام کی تبیین کے بعد فرمایا ہے تلك حدود اللہ فلا تقربوھا "یہ ہیں حدود اللہ. پس تم، ان سے تجاوز تو ایک طرف، ان کے قریب بھی نہ جاؤ. دور دور رہو. مبادا کوئی قدم نادانستہ ہی ایسا اٹھ جائے جو اس جادۂ اعتدال کو تجاوز کر جائے" کذالك یبین اللہ اٰیاتہ للناس لعلھم یتقون (اس طرح اللہ اپنے احکام، انسانوں کیلئے وضاحت سے بیان کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ شعار ہو جائیں) ان لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کبھی ان سے کوئی برائی کی بات سرزد ہو جائے تو اس پر سخت نادم ہوتے ہیں اور غلط قدم کو واپس لوٹا کر (توبہ کرکے) پھر سے راہِ مستقیم پر گامزن ہو جاتے ہیں. الذین اذا فعلوا فاحشۃ او ظلموا انفسھم ذکروا اللہ فاستغفروا لذنوبھم (۳/۱۳۴) "جب کبھی ان سے کوئی برائی سرزد ہو جاتی ہے یا اپنے کو (غلط اقدام سے) مصیبت میں ڈال لیتے ہیں تو فوراً اللہ کی یاد ان کے قلب میں جاگ اٹھتی ہے اور وہ اپنے خدا سے ملتجی ہوتے ہیں کہ وہ انہیں اس غلط قدم تباہ کن نتائج سے محفوظ رکھے" اس سے فوراً ان کی نگاہوں کے سامنے روشنی آجاتی ہے جس سے غلط اور صحیح راہ میں تمیز ہو جاتی ہے۔

ان الذین اتقوا اذا مسھم طٰئف من الشیطان تذکروا فاذا ھم مبصرون (۷/۲۰۱)

تقویٰ شعار لوگوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب کبھی ان کو شیطان کی طرف سے کوئی خیال پہنچتا ہے

تو وہ فوراً (خدا کو) یاد کر لیتے ہیں جس سے یکایک ان کے سامنے روشنی آجاتی ہے۔

اور خدا کی مسلسل یاد[1] سے متقین کو ایک ایسا نورِ بصیرت حاصل ہو جاتا ہے جو دنیا کے تمام نشیب و فراز اُن کی نگاہوں کے سامنے واضح طور پہلے آتا ہے اور اس طرح یہ جماعت مومنین خود بھی بلا خوف و حزن اپنے نصب العین کی طرف فرحاں و شاداں بڑھے جاتی ہے اور کاروانِ انسانیت کی قیادت سے انھیں بھی ان کے منزلِ مقصود کی طرف لے جاتی ہے۔

یا ایہا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ و اٰمنوا برسولہ یؤتکم کفلین من رحمتہ و یجعل لکم نوراً تمشون بہ۔۔۔ (۵۷/۲۸)

اے ایمان والو۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور رسول پر ایمان لاؤ۔ وہ تمہیں اپنی رحمت سے دو حصے عطا کرے گا۔ اور تمہیں ایک ایسی روشنی عنایت کرے گا جس سے تم (تمام دنیا میں) چلو گے۔

اور اس طرح تمام اقوامِ عالم میں تمہیں ایک امتیازی حیثیت عطا کر دے گا۔ یا ایہا الذین اٰمنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقاناً (۸/۲۹) "اے مدعیانِ ایمان۔ اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو گے تو وہ تمہارے لئے ایک امتیازی شان پیدا کر دے گا" اور پھر تمہیں، خدا کے سوا، کسی کا خوف نہیں رہے گا اس لئے کہ یہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ

فمن اتقی و اصلح فلا خوف علیہم ولا ھم یحزنون (۷/۳۵)

جو کوئی تقویٰ اختیار کرے اور اپنے لئے صالحیت پیدا کرے تو اس پر کسی قسم کا خوف و حزن نہیں رہے گا۔

یہ "تقویٰ اور صالحیت" کس طرح سے حاصل ہو گا؟ قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے سے۔ یعنی ایمان اور حسنِ عمل سے۔

من اسلم وجہہ للہ و ھو محسن فلہ اجرہ عند ربہ۔ ولا خوف علیہم ولا ھم یحزنون (۲/۱۱۲)

جس نے اللہ (کے قوانین) کے سامنے سر جھکا دیا اور نیک عمل کئے تو اس کا اجر اس کے اللہ کے ہاں ہے۔ وہ اجر کیا ہے؟ اس کیلئے کسی قسم کا خوف ہے نہ غمگینی۔

اس متقی قوم کو دنیا کی کوئی طاقت مرعوب نہیں کر سکتی۔ اقوامِ عالم میں بلند ترین مقام (الاعلون) جن کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے وہ یہی ہیں۔ یہ درست ہے کہ تسخیرِ فطرت سے، تقویٰ کے بغیر، تھوڑے سے وقت کیلئے قوت و حشمت، اور ثروت و دولت حاصل ہو جاتی ہے لیکن چونکہ یہ آشیانہ شاخِ نازک پر بنا ہوتا ہے اس لئے استوار نہیں ہوتا۔ ہوا کا ایک تند و تیز جھونکا اسے خاک نشین کر دینے کیلئے کافی ہوتا ہے۔ آج دیکھئے! اقوامِ مغرب

---

[1] آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ "یادِ خدا" کے معنی کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تسبیح پھیرنے کے نہیں ہیں۔ نہ ذکر اللہ سے مراد لا الٰہ الا اللہ کی ضربیں لگانے کے ہیں۔ یہ سب معانی عجمی تصوف کا نتیجہ ہیں جس نے قرآن پر زنگار رنگ کے غلاف چڑھا رکھے ہیں۔

اس تقویٰ کی کمی کی وجہ سے اپنی ہلاکت اور تباہی کو ایک حقیقتِ ثابتہ کی طرح اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہی ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت انھیں اس بربادی کے جہنم سے نہیں بچا سکتی۔ وما لھم من ولیا وما لھم من نصیر۔ لیکن جب تسخیرِ فطرت کے ساتھ تقویٰ شامل ہو جائے تو اس کے نتائج مستقل اور پائیدار ہوتے ہیں۔ انھیں دنیا کی کوئی قوت چھین نہیں سکتی۔ اس سے وہ حیاتِ خلد (زندگی جاوید) اور ملک لا یبلیٰ (مملکت سرمدی) اس کو حاصل ہوتی ہے جس کو فنا کا خطرہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے فرمایا۔

لا یغرنک تقلب الذین کفروا فی البلاد۔ متاع قلیل۔ ثم ماوٰھم جہنم و بئس المھاد۔
لکن الذین اتقوا ربھم لھم جنت تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا نزلا من
عند اللہ۔ وما عند اللہ خیر للابرار (۳/۱۹۶-۱۹۸)

اے پیغمبر! جن لوگوں نے کفر کی (غلط) راہ اختیار کی ہے۔ ان کا (عیش و کامرانی کے ساتھ) ملکوں میں سیر و گردش کرنا تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے۔ یہ جو کچھ ہے ناپائیدار ہے۔ صرف تھوڑا سا فائدہ اٹھانا ہے۔ بالآخر ان کا ٹھکانا (تباہی اور بربادی کی) جہنم ہے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔

لیکن جن لوگوں نے تقویٰ کی راہ اختیار کی تو ان کے لئے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (تاکہ ان کی شادابی اور شگفتگی ہمیشہ قائم رہے) وہ ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے۔ یہ قرآن کی مہمانی اللہ کی طرف سے (اس دنیا میں ہوگی) اور جو کچھ حسنِ عمل کرنے والوں کے لئے (بعد کی زندگی میں) اللہ کے ہاں ہے وہ اس سے بھی بہتر ہے۔

دیکھئے! یہاں غلط راہ اختیار کرنے والوں (کفار) کے متعلق کہا ہے کہ انھیں جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ متاعِ قلیل ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ دنیاوی زندگی میں (جو چند روزہ ہے) عیش و کامرانی کے دن بسر کریں گے اور عاقبت میں جہنم میں داخل کئے جائیں گے۔ اور متقی، دنیا میں (معاذ اللہ) نکبت اور زبوں حالی کی زندگی بسر کریں گے اور آخرت میں بہشت میں داخل ہوں گے۔ ایمان اور تقویٰ سے کس طرح اس دنیا میں سرفرازی و سربلندی، شوکت و حشمت کی زندگی حاصل ہوتی ہے، یہ الگ موضوع ہے، جس پر (انشاء اللہ) کسی دوسرے وقت تفصیل سے لکھا جائیگا نیز اس شق کے متعلق بھی کہ جہنم اور جنت کا سلسلہ کس طرح انسان کی اسی زندگی سے شروع ہو کر حیاتِ اخروی تک ساتھ جاتا ہے۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ تقویٰ کا فطری نتیجہ ایسی کامرانی و شادکامی کی جنت ہے جس میں کبھی خزاں نہیں آسکتی۔ لہٰذا اگر کسی قوم کو سربلندی حاصل ہونے کے بعد نکبت و زبوں حالی کی زندگی کی طرف لوٹنا پڑتا ہے تو اسے یاد رکھنا چاہئے کہ وہ قوم تقویٰ شعار نہیں رہی۔ خدا کی میزان میں کافر نہاد ہو گئی ہے آیاتِ بالا میں کفر اور تقویٰ میں تقابل کے معنی ہی یہ ہیں کہ کافرانہ اندازِ قلب سے تسخیرِ فطرت کے نتائج پائیدار نہیں ہوتے۔ یہ جھوٹے نگوں کی ملمع کاری ہوتی ہے جس سے کچی نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن تقویٰ کے نتائج اعمال، ہمیشہ رہنے والے ہوتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا کہ والعاقبۃ للمتقین (۷/۱۲۸) یعنی کفر و ایمان کی اس

کشمکش میں انجام کار ہمیشہ متقیوں کے ہاتھ میں رہے گا۔ آخری فتحمندی تقویٰ کو ہوگی نہ کہ غلط راہ پر چلنے والے کفر کو۔ والعاقبۃ للتقویٰ (۲۰/۱۳۲)

یہاں تک ہم نے یہ دیکھا ہے کہ قوانین کی صحیح اتباع، محض تقویٰ کی رو سے ہو سکتی ہے۔ جس نظامِ حیات (دین) میں، قوانین کی اتباع اس اصل الاصول پر قائم نہیں، نہ ان قوانین کی صحیح اتباع ہی ہو سکے گی اور نہ ہی ان سے کوئی پائیدار نتیجہ ہی مرتب ہوگا۔ اسی بنا پر قرآنِ کریم نے یہ حقیقت بھی واضح کر دی ہے کہ خود قرآنی احکام کی اتباع بھی اگر رسماً کی جائے اور اس میں "دل کا جھکاؤ" شامل نہ ہو تو وہ اعمال کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے۔ ایک نظام میں چھوٹے سے چھوٹا قاعدہ بھی اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتا ہے، جس طرح ایک مشین میں، ایک حقیر سا پیچ بھی اپنے مقام میں قطب تارے سے کم نہیں ہوتا۔ اسی لئے دیکھئے (مثلاً) قرآن کریم میں سمتِ قبلہ کی تعیین اور اس سے اعتصام و تمسک کو کس طرح تاکید سے بیان کیا گیا ہے حالانکہ یہ بھی ساتھ ہی کہدیا گیا ہے کہ وللّٰہ المشرق و المغرب (مشرق و مغرب کی سمتیں سب خدا ہی کی ہیں)۔ لیکن اس کے بعد یہ بھی فرما دیا کہ قبلہ کی سمت کا اعتصام بے معنی ہے اگر اس اعتصام کے ساتھ تقویٰ شامل نہیں۔ لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب (۲/۱۷۷) "نیکی فقط اس میں نہیں کہ تم نے اپنا منہ مشرق کی طرف کر لیا یا مغرب کی طرف۔" نیکی کے لئے اس پورے نظام پر کاربند ہونا ہوگا جس کی بنیاد قیامِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے محکم اصولوں پر استوار ہے اور ان تمام امور کے ساتھ تقویٰ شعاری لازمی ہے۔ اولٰئک الذین صدقوا واولٰئک ھم المتقون (۲/۱۷۷) "یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے دعووں کو سچا کر دکھایا اور یہی وہ لوگ ہیں جو تقویٰ شعار ہیں"۔ اسی طرح معاشرتی زندگی کے نظم و ضبط اور حدود و قیودِ متعارفہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ قاعدہ یہی ہے کہ تمہیں اپنے گھروں میں دروازوں کی سمت سے داخل ہونا چاہئے لیکن یہی نہ سمجھ لینا کہ قانون کی پابندی ان شقوں کی رسماً اتباع سے حاصل ہو جائے گی۔ اصل چیز تقویٰ ہے۔ لیس البر بان تاتوا البیوت من ظھورھا ولکن البر من اتقی۔ واتوا البیوت من ابوابھا۔ واتقوا اللّٰہ لعلکم تفلحون (۲/۱۸۹) "تم نے حج کے سلسلہ میں یہ جو پابندیاں عائد کر رکھی ہیں کہ احرام کے بعد، گھروں میں دروازے سے داخل نہیں ہوتے، پچھواڑے سے نکل جاتے ہو۔ تو اس میں کوئی نیکی کی بات نہیں کہ تم دروازہ چھوڑ کر پچھواڑے سے داخل ہو۔ اصل نیکی تو تقویٰ میں ہے۔ گھروں میں دروازوں کے راستے سے ہی آیا کرو۔ لیکن اس کے بعد بھی یہ سمجھ لو کہ دروازوں کی راہ سے آنا عملِ نیک ہو گیا۔ اس کے عمل صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ کامیابی کی یہی راہ ہے۔" لہٰذا کامیابی کی راہ یہ ہے کہ قوانین و ضوابط کی اطاعت، تقویٰ کی بنیاد پر ہو۔ اگر تم بظاہر قانون و آئین کی شقوں پر عمل پیرا بھی ہو گئے لیکن اس اتباع و اطاعت کا جذبہ محرکہ تمہارے دل کی وہ کیفیت نہ ہوئی جسے تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تو اس التزامِ آئین اور اعتصامِ قوانین کا وہ نتیجہ مرتب نہیں ہوگا جو تمہیں تمہاری منزلِ مقصود کی طرف لے جائے۔ اسی لئے فرمایا کہ آئین و رسوم کی پابندیوں سے اپنے آپ کو

مزکی ومقدس نہ سمجھنے لگ جاؤ (فلا تزکوا انفسکم) وہ خدا، جس کی نگاہ قلوب اوران کے ارتعاش پر ہے، خوب جانتا ہے کہ ان پابندیوں کا جذبۂ محرکہ تقویٰ ہے یا نہیں (ھواعلم بمن اتقیٰ - ۵۳/۳۲)۔ حتیٰ کہ جہاد جیسا عملِ عظیم کہ جس میں موت، موت میں حیات کہلاتی ہے مشروط بہ تقویٰ ہوتا ہے۔ اسی لئے فرمایا۔

یاایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون (۵/۳۵)

اے ایمان والو۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس تک پہنچنے کا ذریعہ ڈھونڈو۔ یعنی اس کی راہ میں جہاد کرو۔ تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ۔

لہٰذا ایک مومن کا شعار یہ ہے کہ وہ ہر فیصلہ سے پہلے مرکزِ حکومتِ خداوندی کے حکم کا انتظار کرے اور پھر اس حکم کی اطاعت، تقویٰ کی بنیاد پر ہو۔ یہی ہے وہ حقیقتِ کبریٰ جسے سورۂ حجرات کی پہلی آیت میں ان جلیل القدر الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ

یاایھا الذین اٰمنوا لاتقدموا بین یدی اللہ ورسولہ۔ واتقوا اللہ۔ ان اللہ سمیع علیم (۴۹/۱)

اے مدعیانِ ایمان۔ کسی معاملہ میں، خدا اور رسول کے فیصلہ سے سبقت نہ کرو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

یہ ہیں جبلیلہ، ہمارے نظامِ شریعت کی اصلی اصول اور عمود تام ہے۔ ہر معاملہ میں مرکزِ حکومت خداوندی کے فیصلہ کا انتظار اور اس کے بعد خالصۃ لوجہ اللہ اس پر عمل۔ بلاچون وچرا، دل کے جھکاؤ اور روح کی فریفتگی کے ساتھ عمل۔ اس ایمان اور یقین کے ساتھ عمل کہ یہ حرکت، اس سمت کو ہے جو کاروانِ انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جانے والی ہے۔ اگر تمہاری حسنِ نیت میں ذراسی خرابی یا اس اخلاص مقصد میں کسی آمیزش کا شائبہ بھی آگیا تو وہ مرکزِ حکومت سے تو چھپا ہوا رہ سکتا ہے لیکن خدا سے چھپا ہوا نہیں رہ سکتا کہ ان اللہ سمیع علیم لہٰذا فرمایا کہ فاعبد اللہ مخلصاً لہ الدین (۳۹/۲)۔ اللہ کی عبودیت اختیار کرتے ہو تو اس خلوص کے ساتھ اختیار کرو کہ اس اطاعت میں کسی اور مقصد کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ یاد رکھو۔ الا للہ الدین الخالص (۳۹/۳) تمہاری راہِ عمل خالص اللہ کی متعین کردہ منزل کی طرف لے جانے والی ہو۔ اگر اس تسلیم ورضا اور اس انقیاد واطاعت میں کوئی اور جذبہ بھی شامل ہوگیا تو یہ کفر صریح ہے۔ یہ شرکِ جلی ہے۔ دیکھئے! اس حقیقت کو ایک غیر مسلم مؤرخ بھی کس عمدگی سے سمجھا ہے۔ (Spalding) اپنی کتاب (Civilization in East and West.) میں لکھتا ہے۔

چنانچہ (قرآن نے) انسان کے تمام فرائض کو ایک لفظ میں سمیٹ کر رکھدیا ہے۔ اور وہ لفظ ہے اسلام۔ یعنی اپنے جذبات اور ارادوں کو مشیتِ ایزدی کے تابع رکھنا۔ یہ تسلیم ورضا اس اطاعت وانقیاد سے یکسر مختلف ہے جو مادی ریاست میں حکومت کی طرف سے مطلوب ہوتی ہے۔ کسی سولینی کے سامنے جھکنے اور خدا کے سامنے جھکنے میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ جو اس طرح جھک کر مسلم بن جاتے ہیں

کی سرانجام دہی میں رکاوٹ پیدا کرے ناروا اور ناواجب ہے۔

عیسائیت کی غیر فطری تعلیم نے عورت کو تمام گناہوں کا سرچشمہ اور روحِ خبیث بتا کر اسے سوسائٹی کی نگاہوں میں اس درجہ ذلیل اور قابلِ نفرت بنا دیا کہ وہ صدیوں تک زمین کی چھاتی پر بوجھ بن کر پھرتی رہی۔ اس ناکردہ گناہ کی پاداش نے عورت کے تحت الشعور میں مردوں کے خلاف بے پناہ جذبۂ انتقام پیدا کر دیا جو ان کے اس "مقدس استبداد" کے ساتھ ساتھ جسے کلیسا کے فتووں نے منزل من اللہ قرار دے رکھا تھا، آتشِ خاموش کی طرح سلگتا رہا۔ جس وقت یورپ میں کلیسا کا آہنی چنگل کمزور ہوا، یہ سلگتی ہوئی آگ شعلہ جوالہ بن کر بھڑک اٹھی اور جوشِ انتقام نے عورت کو بالکل پاگل بنا دیا۔ گذشتہ پچاس برس میں یورپ کی عورت نے اس ضمن میں جو کچھ کیا ہے وہ اس پاگل پن کا مظاہرہ تھا۔ کلیسا نے اپنے استبداد کو مذہبی تقدس کے نقاب میں چھپایا تھا۔ مغرب کی عورت نے اپنے جنونِ آتشِ انتقام کو آزادی کا نام دے کر اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ مقصودِ فطرت نہ وہ تھا نہ یہ۔ وہ تفریط تھی یہ افراط۔ وہ جوئے زندگی کو گھٹا کر کم آب بناتا تھا۔ یہ شکستِ ساحل سے اسے سیلاب میں تبدیل کرنا۔ عورت کا صحیح مقام نہ وہ تھا نہ یہ۔ اس میں شبہ نہیں کہ مصافِ زندگی میں مردوں کے ہم دوش بلکہ بالائے سر ہونے کے جذبہ سے وہاں کی عورت نے جسمانی اور مادی طور پر بہت سے امور میں نمایاں ترقی حاصل کی ہے اور اس طرح بعض شعبوں اور گوشوں میں ان کی اس ترقی سے فائدہ بھی حاصل کیا گیا ہے، بالخصوص دورانِ جنگ میں۔ لیکن ان کے اپنے فطری مقام کو کھو دینے سے جو نقصانِ عظیم اقوامِ مغرب کو پہنچا ہے اس کی تلافی کسی صورت میں نہیں ہو سکتی۔ وہاں کی عورت نے، اس پچاس سالہ تگ و تاز اور سعی و کاوش کے بعد، عورت کا جو فریضۂ زندگی متعین کیا ہے وہ انہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ (Woman's Mission on Earth is to Display Charm)

"دنیا میں عورت کا مقصودِ زندگی نمائشِ حسن ہے"۔ یہ وہی چیز ہے جسے قرآن "تبرج الجاھلیہ" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جسے اقبال "جلوت کی ہوس" کہہ کر پکارتا ہے۔

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے ... روشن ہے نگہ، آئینۂ دل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے ... ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے ... وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر
خلوت میں خودی ہوتی ہے خودگیر و لیکن ... خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسر

جلوت (یا تبرجِ جاہلیہ) سے مفہوم صرف بے پردگی نہیں اور نہ ہی خلوت سے مراد گھر کی چار دیواری میں بندش یا برقعہ کا نقاب ہے۔ پردہ کا مسئلہ الگ ہے۔ اس وقت ہم صرف اس نظریۂ حیات سے بحث کر رہے ہیں جو مغرب کی عورت نے اپنے لئے متعین کیا ہے۔

محکوم قوم نفسیاتی طور پر نقال ہو جاتی ہے اور وہ حاکم قوم کی ہر ادا میں اپنے لئے شانِ محبوبیت پاتی ہے

---

[1] قرآن نے جب کہا کہ وکونوا قردۃ خاسئین (وہ ذلیل بندر ہو گئے) تو اس سے اسی Apish Mentality کی طرف اشارہ کیا

چونکہ اس کے قوائے عملیہ مفلوج ہو چکے ہوتے ہیں اس لئے اس نقالی میں بھی وہ صرف ان باتوں کی تقلید کرتی ہے جن کے اختیار کرنے میں کسی سعی و کاوش اور رنگ و تاز کی ضرورت لاحق نہ ہو۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ محکوم قوم، قوم غالب کے محاسن و محامد کی تو نقل نہیں کرتی، ان کے نقائص و عیوب کو ایک ایک کر کے اختیار کر لیتی ہے۔ انگریز کی سو سالہ حکومت کے دوران میں ہم نے ان سے سوٹ، سگریٹ، کاک ٹیل، برج سے زیادہ کچھ نہ سیکھا اور ہماری خواتین نے عریانئ ساعد و سینہ اور رنگینئ غازہ و گلگونہ ہی میں یورپ کی عورت کی تقلید کا راز جانا۔ اب انگریز کا سانپ نکل چکا ہے لیکن اس کی یہ لکیریں، ہماری مایۂ ناز تہذیب کی شکل میں، ہمارے پیکرِ زندگی پر منقوش ہیں۔ یہ ہے وہ نظریۂ حیات جس کا مظاہرہ ہماری خواتین کی محافل و مجالس میں آئے دن ہوتا رہتا ہے اور یہ ہے وہ زاویۂ نگاہ جسے ہم محلِ نظر سمجھتے اور قوم کے حق میں زہرِ ہلاہل تصور کرتے ہیں۔

قوم افراد کے مجموعہ کا نام ہوتی ہے اس لئے قوم کی متاعِ حقیقی اس کے فرزندانِ غیور و جسور ہوتے ہیں۔

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر — نیست از نقد و قماش و سیم و زر

مالِ او فرزند ہائے تندرست — تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست

ان فرزندانِ جسور و غیور کی تربیت گاہ، ماں کی گود ہوتی ہے۔ قرآن نے قوم کے لئے اُمت کا لفظ استعمال کیا ہے اور عربی زبان میں اُمت کا مادہ اُم ہے جس کے معنی ہی ماں ہیں۔ لہٰذا قرآن کی رو سے اُمت، ماں ہی کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک عورت کا فریضۂ حیات ہے **تعمیرِ ملت**۔

از امومت پختہ تر تعمیرِ ما — در خطِ سیمائے او تقدیرِ ما

"قوم کی تقدیر، فرزندانِ قوم کی ماؤں کی پیشانیوں سے ظاہر ہوتی ہے" اس لئے ماں کی آغوش

سیرتِ اقوام را صورت گر است

دورِ حاضرہ کے علم النفس کے ماہرین، بالخصوص علم تجزیۂ نفس کے امام مثل فرائیڈ، جنگ اور آڈلر اپنے عمر بھر کے تجربات و مشاہدات کے بعد جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بچے نے جو کچھ اپنی عمر میں بننا ہوتا ہے وہ آغوشِ مادری ہی میں بن چکتا ہے۔ بلکہ جنگ کے نظریہ کی رو سے اس کی تعمیرِ سیرت کی ابتدا، پیدائش سے بھی پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ چونکہ یورپ کی عورتیں اولاً تو بارِ امومت (Mother hood.) ہی کو صبر آزما تصور کرتی ہیں، اور پھر بچے کی پیدائش کے بعد اس کی پرورش اور تربیت کو اپنے پروگرام سے خارج ہونے کا سبب اس لئے ان بچوں کی پرورش بالعموم مشترکہ تربیت گاہوں میں ہوتی ہے۔ انہی ماہرین علم نفسیات کا فیصلہ ہے کہ اس طرح بچے گو جسمانی طور پر تندرست و توانا ہوتے ہیں لیکن ان کے قلب و دماغ کی تربیت صحیح خطوط پر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ماں کی گود کے سوا اور کوئی گہوارہ نہیں۔ انھوں نے بھی اس حقیقت کو اپنی قوم پر واضح کر دیا ہے کہ:۔

جہاں را محکمی از امہات است　　　نہادِ شاں امینِ ممکنات است
اگر ایں نکتہ را قومے نداند　　　نظامِ کاروبارش بے ثبات است

یورپ کے سامنے اپنا نظریۂ زندگی ہے۔ اس سے ہمیں سردست بحث نہیں۔ ہم اپنا ایک مخصوص نصب العین حیات رکھتے ہیں اور ہماری قوم اس نصب العین کی حامل اور پیغام بردار نہیں ہو سکتی ہے جب تک یہ نصب العین ہماری قوم کے نوجوانوں کے رگ و پے میں سرایت نہ کر چکا ہو۔ اور یہ ناممکن ہے جب تک اس سلسلۂ تعمیرِ قلب و دماغ کی ابتدا ماں کی گود سے نہ ہو۔ اگر ہماری قوم کی خواتین و مخدرات مغرب کی عورتوں کی تقلید میں آرٹ اور موسیقی اور رقص و سرود ہی کو کمالِ زندگی تصور کرنے لگ گئیں اور اسی میدان میں مسابقت و منافست ہی وجۂ امتیاز و افتخار قرار پا گیا تو ان تربیت گاہوں سے جس قسم کے نوجوان برومند ہوں گے وہ ظاہر ہے۔ اسلئے کہ

سیرتِ فرزند ہا از امہات　　　جوہرِ صدق و صفا از امہات

کہتے ہیں کہ ابدالی کی فوج میں ایک سپاہی شہید ہو گیا جب فوج واپس گئی تو اس کی ماں نے دوسرے سپاہیوں سے اپنے لختِ جگر کی شہادت کا حال پوچھا۔ ایک سپاہی نے کہا کہ اس نے پیٹھ میں گولی کھائی تھی، سینے میں نہیں۔ ماں کا چہرہ تمتما اٹھا اور اس نے کامل یقین و وثوق کے ساتھ کہا کہ تم غلط کہتے ہو۔ میرا بچہ کبھی میدانِ جنگ سے نہیں بھاگ سکتا۔ اس لئے کہ میں نے اسے جو دودھ پلایا تھا اس میں ایک قطرہ بھی ایسا نہ تھا جو ایسی خوراک سے بنا ہو جس کے رزقِ حلال ہونے میں شبہ ہو۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ میدانِ جہاد سے بھاگ نکلے! ہم جانتے ہیں کہ تعلیمِ مغرب نے جس درجہ ہمارے ذہنوں کو ماؤف کر رکھا ہے اس میں رزقِ حلال و حرام کے ایسے دور رس اثرات کو صحیح سمجھنے کیلئے ہماری طبائع کچھ تامل سا محسوس کریں گی۔ لیکن اتنا تو بہر حال ڈاکٹر واٹسن کے تجربات (Behaviourism) سے بھی واضح ہے کہ وراثت اور ابتدائی ماحول کے نقوش کس طرح انسان کی سیرت کو بدل ڈالتے ہیں۔ لہٰذا یہ حقیقت ہے کہ ہمیں جس قسم کے نوجوان مطلوب ہوں، اسی قسم کی تربیت گاہیں درکار ہوں گی۔ اور یہ تربیت گاہیں، ماں کی گود سے الگ کہیں نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے ہم اپنی قوم کی خواتین سے باادب گذارش کریں گے کہ تقلیدِ مغرب میں ان کی یہ روشِ زندگی، ایک بہت بڑے قومی نقصان کا موجب بن رہی ہے۔ جس انّا کا دودھ آپ کا بچہ پیتا ہو، اس انّا کی خوراک پر آپ خاص نگاہ رکھتی ہیں۔ اس لئے نہیں کہ غلط خوراک سے انّا کو تکلیف ہو جائے گی بلکہ اس لئے کہ اس کا اثر آپ کے بچے کی صحت پر پڑے گا۔ جب آپ بچے کی جسمانی صحت کے متعلق اس قدر خیال رکھتی ہیں تو اس کی تربیت کی طرف بھی تو خیال رکھئے۔ اور اس کی تربیت کا گہوارہ خود آپ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح انّا کے سپرد کیا ہوا بچہ اس کے پاس بطور امانت ہوتا ہے، اسی طرح آپ کے بچے در اصل قوم کی متاعِ عزیز ہیں اور آپ کے پاس بطور امانت۔ آپ کو اس امانت کے بارے میں بڑی احتیاط برتنی ہوگی۔ کوئی ماں، ایامِ حمل کے زمانہ میں اونچا نیچا قدم نہیں رکھتی۔ اس لئے کہ اس سے جنین کی موت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ کو روشِ حیات میں بھی کوئی قدم غلط سمت میں نہیں اٹھانا چاہئے کیونکہ اس سے قوم کے

جس کی حیات طیبہ یہ تھی کہ

آسیا گرداں و لب قرآں سرا

اس مقام پر ہم اپنی ان محترم خواتین سے خاص طور پر خطاب کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے معاشرہ میں آج ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ محض اللہ کا احسان و انعام ہے کہ اس نے آپ کو یہ مقام عطا فرما دیا۔ لیکن اس مقام بلند کے جتنے بڑے مدارج ہیں اتنی ہی اہم اس کی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ آپ اس مقام پر ہیں جہاں سے آپ کی ہر روش دوسروں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور وہ آپ کی زندگی کو اپنے لئے نمونہ بناتی ہیں۔ اس لئے آپ پر دہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایک اپنے آپ کی، ایک دوسروں کی۔ فلہذا آپ کے لئے اور بھی ضروری ہے کہ آپ اپنے سامنے وہی نصب العین زندگی رکھیں جو اسلام نے آپ کے لئے متعین کیا ہے اور آپ کا کوئی قدم اس راہ سے الگ نہ اٹھے جو راہ اس نصب العین کی طرف لے جانے والی ہے۔ پاکستان میں بے شمار کام آپ کے کرنے کے ہیں۔ ان کی طرف توجہ دیجئے۔ "طاؤس و رباب" قوموں کو سلانے کا کام دیتے ہیں۔ جگانے کا نہیں۔ حالانکہ اگر اللہ نے ہماری شب غلامی کو ختم کیا ہے تو آپ کا فریضہ یہ ہے کہ قوم کے بچوں کو جگانے کی فکر کریں۔ "طلب مغرب" نے یہ افیون محض اس لئے ایجاد کی تھی کہ اس سے محکوم قوم کے بچوں کو سلانے کا کام لیا جائے۔ اس افیون کی ڈبیا کو بہ تشکر واپس کر دیجئے اور ان سے کہہ دیجئے کہ جو کچھ رب حکیم نے ہمارے لئے تجویز کیا ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے۔ ملت کا احیاء اور اس میں قرآن کی روح کا نفوذ، آپ ہی کے ہاتھوں سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ

حافظِ رمزِ اخوت مادراں قوتِ قرآن و ملت مادراں

اسلام کی خواتین کے لئے باعثِ فخر و نازش، واجب التکریم مائیں بن کر امت کی تعمیر کرنا اور اس کی زندگی میں جی کر حیاتِ دوام حاصل کرنا ہے۔ نہ کہ چینی کی گڑیائیں بن کر دل بہلانے کا سامان فراہم کرنا اور ٹوٹ جانا۔

بچیا چھڑانا ہی ہوگا، ورنہ اس دنیائے جہد و عمل میں ہمارا ہر اقدام مکثرتِ تعبیر کی پریشانی کا شکار ہوتا رہے گا۔ علامہ مرحوم نے بجا فرمایا تھا:-

کار ما ابتر ز کار دیں شدہ است
ہر لئیمے رازدار دیں شدہ است

علاج اختلاف میرے نزدیک اس شکل کا ایک ہی شافی حل ہے، اور وہ یہ کہ حکومت کی زیر سرپرستی ایک اسلامی مرکز تشکیل کیا جائے۔ سب سے بہتر بات یہ ہے کہ اس کو تمام اسلامی ممالک میں مرکزی حیثیت حاصل ہو، اس کے ارکان عالم اسلامی کے ایسے علماء سے منتخب کئے جائیں جو صحیح اسلامی روح کو سمجھنے کے ساتھ ضروریاتِ زمانہ پر پوری نظر رکھتے ہوں۔ سود، جہاد، پردہ، زکوٰۃ، خطبات جمعہ و عیدین درج کی ترتیب وغیرہ اجتماعی مسائل کی تفصیلات پر بحث و تمحیص کر کے مسلمہ نتائج کو متعلقہ علاقوں میں نافذ کرنے کا اختیار اسی مرکز کے سپرد ہو۔ عوام و حکام حل مشکلات کے لئے اسی مرکز کی طرف رجوع کریں۔ اس کے فیصلوں کو قانون کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہر مسلم کا فرض ہو۔ اس کے خلاف محاذ قائم کرنا بغاوت سمجھا جائے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ تعمیری تنقید کے طور پر کسی مسئلے میں مدلل اختلاف ارکانِ مرکز کے گوش گزار کر دیا جائے، جیسا کہ خلفائے راشدینؓ کے عہد میں ہوتا رہا ہے۔

اعترافِ راقم مجھے بعض احباب نے پردے کے متعلق اپنی تحقیق سپردِ قلم کرنے کو بار بار کہا، لیکن میں اس پر انہی وجوہ کی بنا پر آمادہ نہ ہو سکا جو بیان کر چکا ہوں، احباب جو مزید اصرار سے متاثر ہو کر قلم اٹھا رہا ہوں تو اس کو میری ایک طالب العلمانہ کوشش سمجھئے۔ میں کسی خاص گروہ کا حامی نہیں۔ قرآن مجید سے جو کچھ سمجھوں گا بیان کر دوں گا اور اگر کوئی صاحب قرآن پاک ہی کی روشنی میں مجھ پر میری کوئی غلطی واضح کر دیں گے تو اسے شکریئے کے ساتھ تسلیم کروں گا۔ انشاء اللہ۔

شرفِ اسلام اسلامی تعلیم کے متعلق میری تحقیق و مطالعہ کا یقینی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کا کوئی ایک حکم بھی ایسا نہیں جس کا ثواب صرف آخرت پر منحصر ہو اور دنیا میں اس سے کوئی نفع حاصل نہ ہو سکے۔ یا وہ صرف دنیا سے تعلق رکھتا ہو اور عاقبت سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ اسلام کی یہ خوبی اتنی ظاہر و باہر ہے کہ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ اسلامی پردہ بھی ایک ایسا ہی حکم ہے جو کسی وہمی یا قدیم رسم و تقلید پر مبنی نہیں، بلکہ نسوانی فطرت کا مقتضا ہے۔ انسانی تمدن و معاشرت کی گاڑی کو صحیح لائن پر چلانے کیلئے اس کی اشد ضرورت ہے۔ تزکیہ نفس اور روحانی عروج کیلئے بھی اس کا اہتمام لازم ہے۔ چنانچہ جہاں جہاں احکام پردہ صادر فرمائے ہیں، وہاں ان حقائق کی بھی تصریح کی گئی ہے۔

حکمتِ حجاب سب سے پہلی آیت جو ہمیں اس باب میں ملتی ہے۔ اس کے آخری لفظ یہ ہیں:-

ذٰلک ازکیٰ لہم (نور - ۳۰)

یہ (غض بصر و حفظ فرج) نہایت ہی پاکیزگی ہے ایمان داروں کے لئے۔

اگلی آیت جو تفصیلِ حجاب پر مشتمل ہے، اس کے آخری لفظ یہ ہیں:-

لعلکم تفلحون (نور - ۳۱)

(پردے کا) مقصد یہ ہے کہ تم اپنے اعلیٰ مقاصد میں کامیابی حاصل کرسکو۔

سورۂ احزاب میں ازواج النبی صلعم کے پردے کا ذکر ہے، وہاں ساتھ ہی ساتھ ہمیں غایت پردہ کے متعلق یہ تعلیم ملتی ہے۔

اِنّما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا ہ (احزاب - ۳۳)

اے نبی کے گھروالو! اللہ تو تم سے گندی باتیں دور رکھنے اور تم کو پاکیزہ بنانے کا ارادہ کرتے ہیں۔

اس مقام سے آگے جہاں مسلمانوں کو بیت نبویؐ میں داخلے کے آداب سکھائے ہیں اور ازواج مطہرات سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے سے باہر کھڑے ہو کر مانگنے کی تعلیم دی ہے۔ آخر میں فرمایا ہے:-

ذالکم اطھر لقلوبکم وقلوبھن (احزاب)

(مسلمانو!) یہ (حجاب) بہت پاکیزگی ہے تمہارے دلوں کیلئے اور ان (ازواج النبیؐ) کے دلوں کے لئے۔

یہ پردے کی چار آیتوں کے تتمے ہیں جو اپنے اندر اخلاق و روحانیات کی دنیا لئے ہوئے ہیں۔

تفصیل حجاب

اب ہم قدرے تفصیل سے آیاتِ حجاب پر نظر ڈالیں گے۔ یہ سورۂ نور ہے۔ ذکر چل رہا ہے سزائے بہتان، انسداد فحش اور آپس کے گھروں میں آمد و رفت کا۔ اس سلسلے میں موقع و محل کی مناسبت سے فرماتے ہیں، بدی سے روکنے کا ایک نہایت اہم طریقہ یہ بھی ہے کہ

قُلْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ یَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ

اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ (نور - ۳۱)

ایمان والوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ بات ان کیلئے زیادہ پاکیزگی کی ہے۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ تم کو سب خبر ہے۔

مردوں کی آنکھوں اور شرم گاہوں پر پہرہ لگا دینے کے بعد، حکم کی باگ عورتوں کی طرف مڑتی ہے، کیونکہ اگر مرد اصلاح یافتہ نہیں تو محض عورت سے اصلاح کی توقع رکھنا بے معنی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

وقل للمؤمنات یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا ما

ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن . . . . . .

ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن وتوبوا الی اللہ جمیعا ایھا المومنون

لعلکم تفلحون - (نور - ۳۲)

اور مومن عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی بعض نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کے موقعوں کو ظاہر نہ کریں، مگر جو ان میں سے ظاہر ہوں اور چاہیے کہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیں اور اپنی زینتوں کو ظاہر نہ کریں مگر اپنے شوہروں کے لئے . . . .
اور اپنے پاؤں زمین پر نہ ماریں تاکہ ان کی پوشیدہ زینتوں کا کسی کو علم نہ ہو جائے، اور اے مومنو! توبہ کرو اللہ کے حضور سب مل کر تاکہ تم کامیابی حاصل کرو۔

ان آیتوں میں دو باتیں غور طلب ہیں :-

۱ــــ بعض نظریں نیچی رکھنا۔

۲ــــ اخفا و اظہارِ زینت۔

"مِنْ" کی حکمت

عام مترجمینِ قرآن "مِنْ اَبْصَارِهِمْ" اور "مِنْ اَبْصَارِهِنَّ" میں "مِنْ" کا ترجمہ کچھ نہیں کرتے، لیکن محتاط اہلِ علم نے اس کو نظر انداز نہیں کیا، یہ "مِنْ" تبعیضیہ ہے۔ یعنی خاص ضرورتوں کے وقت جانبین ایک دوسرے کے چہرے پر نظر ڈال سکتے ہیں، اس کے برعکس "فُرُوْج" کو دونوں جگہ "مِنْ" سے خالی رکھا ہے۔ یعنی "غضِ بصر" میں کچھ ڈھیل ہو سکتی ہے، لیکن "حفظ فرج" میں کوئی گنجائش نہیں، اس کی بہرحال پابندی لازم ہے ــــ مثلاً

ا ــــ پہلی اتفاقی نظر معاف ہے، اس کے بعد فوراً نظر نیچی کر لیں۔

ب ــــ اگر کوئی عورت کسی مقدمے میں گواہ ہو تو اس کو دیکھنا بھی جائز ہے۔

ج ــــ طبی ضروریات کے ماتحت ڈاکٹر بھی آنکھ، زبان وغیرہ کو دیکھ سکتا ہے۔

د ــــ غیر ممالک کے سفر کی دشواریوں میں بھی ایسی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔

ہ ــــ شوہر کا اپنی بیوی پر نظر ڈالنا منع نہیں ــــ وغیرہ ذالک۔

اس ایک "مِنْ" سے اتنے ضروری فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ آیت کی باریکی حضرت مصنف (جل شانہٗ) کی دقتِ نظر اور علم کامل پر دلالت کرتی ہے ــــ حفظ فرج کا مطلب یہ ہے کہ زنا سے قطعاً بچیں۔

شرحِ زینت

اب ہم اخفا و اظہار زینت پر غور کرتے ہیں۔ نگاہ نیچی رکھنے کا حکم مرد و عورت دونوں کیلئے یکساں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مرد مقدم طور پر مامور ہے اور عورت اس کے بعد۔ یہ تقدیم و تاخیر اہل علم و بصیرت کے نزدیک عظیم حکمت پر مبنی ہے ــــ اس سے آگے اخفائے زینت کا حکم عورت کے لئے خاص مزیت ہے، حالانکہ مرد بھی ایک حد تک زینت سے محروم نہیں ہوتے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

یا بنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد (اعراف۔۳۱)

اے بنی آدم ہر نماز کے وقت اپنی زینت لے لیا کرو۔ (یعنی لباس سے آراستہ ہو کر آؤ)

زینت کی تین قسمیں ہیں۔

"اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیں" (چہروں پر نہیں فرمایا) (نور ۳۲)

اس سے کان، گردن اور سینے کی مستوری مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ گھروں کے اندر ہر وقت اس قسم کا اہتمام قائم رکھنا تکلیف سے خالی نہیں۔ لہٰذا اس حکم کا تعلق صرف باہر نکلنے سے ہے، اور اسی سے چہرے کا کھلا رکھنا بھی ثابت ہوتا ہے۔ آیہ "غض بصر" بھی ہمارے اس استدلال کی تائید کرتی ہے۔ اگر عورت کا چہرہ زیر نقاب چھپا ہوا ہے تو مرد کو نیچی نگاہ رکھنے کا حکم بے معنی ہو جاتا ہے۔ جس طرح یہ حکم مرد و عورت دونوں کیلئے یکساں ہے، اسی طرح دونوں کے چہرے یکساں طور پر کھلے ہوئے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ چہرہ مرکزِ زینت ہے، اگر یہ کھلا ہے تو باقی زینتوں کا چھپانا بے سود ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس کو داخل زینت کہو یا مرکزِ زینت ہمیں اس سے قطعاً انکار نہیں، قرآن مجید خود اس کو داخل زینت کہتا ہے اور زینت ہی سے استثنار کرتا ہے۔ کما قال۔

"عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں مگر اس میں سے جو کھلی چیز ہے" (نور - ۳۲)

اس کا مطلب صاف ہے کہ زینت ہی کے بعض حصے ایسے ہیں جو عام طور پر ظاہر کئے جا سکتے ہیں، اور باقی حصے شوہر، باپ وغیرہ خاص خاص متعلقین کے سامنے کھلے رکھنے کی اجازت ہے —— اور آیت کا اگلا حصہ، کہ

"چلنے میں اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ رکھیں کہ لوگوں کو ان کے اندرونی زیور کی خبر ہو جائے" (نور ۳۲)

بھی واضح کر رہا ہے کہ عورت کا گھر سے نکلنا، خرید و فروخت وغیرہ معاملات کو انجام دینا ہرگز ممنوع نہیں ہے۔[۱]

اسوۂ مریمؑ

اس کا ثبوت قرآن پاک کے تاریخی بیانات سے بھی ملتا ہے، حضرت مریمؑ کو وحی الٰہی سے حکم پہنچتا ہے:۔

وارکعی مع الراکعین (آل عمران ۴۲)

(اے مریمؑ) رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر!

---

[۱] عہد سعادت میں ان آیات کا یہی مطلب سمجھا گیا، چنانچہ صحابیات کی طرز زندگی اس پر شاہد ہے —— مثلاً ربیع بنت مسعود زخمیوں کا علاج کرتیں، مجاہدین کو پانی پلاتیں، مقتولین کو میدان جنگ سے اٹھا کر مدینہ منورہ پہنچاتیں اور فوج کی خدمت کرتیں —— ام عطیہ عہد رسالت کے معرکوں میں شریک ہوتیں۔ مجاہدین کے لئے کھانا پکاتیں، ان کے سامان کی حفاظت کرتیں۔ مریضوں کی تیمارداری اور مرہم پٹی کرتی تھیں —— ام عمارہ غزوہ احد میں بڑی پامردی سے لڑیں۔ آنحضرتؐ پر ایک کافر کے وار کو اپنے جسم پر روکا، جس سے ان کے کندھے میں غار پڑ گیا۔ جواباً اس پر تلوار کا وار کیا۔ ابو مسیلمہ کی جنگ میں ان کے جسم پر بارہ زخم آئے اور ایک ہاتھ کٹ گیا —— حضرت عائشہؓ اور ام سلیم جنگ احد میں پائینچے چڑھائے، مشکوں میں پانی لا لا کر زخمیوں کو پلاتی تھیں —— عکرمہ کی بیوی ام حکیم نے سات رومی اپنے ہاتھ سے قتل کئے —— اسماء بنت یزید نے جنگ یرموک میں ۹ رومیوں کو قتل کیا —— خولہ، ملیکہ، ثقفیہ بنت مخرمہ عطر کی تجارت کرتی تھیں، حضرت سودہ دباغت کرتی تھیں اور حضرت اسماء کاشت کاری کرتی تھیں۔ رفیدہ کا باقاعدہ آپریشن روم مسجد نبوی کے پاس تھا۔ تاریخ ایسی مثالوں سے لبریز ہے۔

آیت میں "مع الراکعات" (یعنی رکوع کرنے والیوں کے ساتھ) نہیں فرمایا۔ اس امر کی تعمیل کی اس کے سوا کوئی صورت متصور نہیں ہوسکتی کہ حضرت مریمؑ مردوں میں شامل ہو کر نماز باجماعت پڑھتی ہوں گی ــــ ہیکل کے بداخلاق مجاوروں کی حضرت صدیقہ علیہا السلام سے دل بستگی[2] بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ آپ ہمارے پرتکلف پردے کی پابند نہیں تھیں، اور ایسے غیر اخلاقی امکانات کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو مروجہ مستوری و محجوبی کا کوئی حکم نہیں ملا۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام کو لیکر قوم کے پاس آنا اور بھرے مجمع میں قوم کے مردوں سے مخاطب ہونا بھی اسی خیال کی تائید کرتا ہے[3]۔

زمانہ قبلِ توریت

موسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی واقعات میں بھی ہم کو اس کی تائید ملتی ہے۔ جب آپ مدین کے پانی پر پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ اپنے مواشی کو پانی پلا رہے ہیں، اور دو عورتیں اپنی بکریوں کو روکے ایک طرف کھڑی ہیں۔ بات کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کا باپ بوڑھا ہے۔ اسلئے وہ مردانہ کام کرنے پر مجبور ہیں۔ حضرت موسیٰؑ ان کی مدد کرتے ہیں اور مجمع کو ہٹا کر ان کی بکریوں کو سیراب کر دیتے ہیں، اور پھر الگ کھڑے ہو جاتے ہیں ــــ آیت میں "اِمْرَاَتَیْنِ" کا لفظ آیا ہے، یعنی وہ دو عورتیں تھیں، نابالغ لڑکیاں نہیں تھیں۔ پھر ان کا باپ کوئی عامی اور دین سے بے خبر شخص نہیں تھا، جس نے بے سمجھی سے اپنی جوان بیٹیوں کو گھر سے نکلنے اور مردوں کے سامنے بکریوں کو چرانے، پلانے کی اجازت دیدے رکھی تھی۔ بلکہ وہ پیغمبر تھا جو موسیٰؑ کا خسر بنتا ہے اور شعیبؑ کے نام سے معروف ہوتا ہے[4]۔ اس پہلی ملاقات کا شادی پر منتج ہونا بھی ظاہر کرتا ہے کہ جانبین نے ایک دوسرے کو بے محابا دیکھا اور پسند کیا۔

شہادت سیرت

ممکن ہے کوئی شخص اس طرز معاشرت کو شرائع قبل اسلام سے مختص کہہ کر منسوخ ٹھہرا دے۔ خوش قسمتی سے ہم کو سیرت نبویؐ مندرجہ قرآن سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے:۔

لا یحل لک النساء من بعد ولا ان تبدل بھن من ازواج ولو اعجبک حسنھن (احزاب ۵۲)

اے پیغمبرؐ اس کے بعد تجھ کو عورتیں حلال نہیں اور نہ ان میں تبدیلی کی اجازت ہے، اگرچہ تجھ کو ان کا

حسن صورت کتنا ہی اچھا معلوم ہو۔

یعنی نکاح سے پہلے یا اجنبیت کی صورت میں جائز مقصد سے کسی عورت کے حسن صورت پر نگاہ ڈالنا ممنوع نہیں۔ اس آیت کا آخری ٹکڑا یہ ہے۔

وکان اللہ علی کل شیئٍ رقیبا۔

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگراں ہیں۔

یعنی تمہاری بدنگاہی یا نیک نگاہی اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ اس میں بھی لطیف اشارہ مروجہ ستور کا کے خلاف جا رہا ہے۔

---

[1] مریم ۶ ۔ [2] آل عمران ۴۵ ۔ [3] مریم ۲۹ ۔ [4] قصص ۲۲ تا ۲۹

حدود و قیود

اس رخصت کے ساتھ گھر سے نکلنے اور اظہار زینت پر کچھ حدود و قیود بھی لگادی گئی ہیں۔ ازواج النبیؐ کو خصوصاً خطاب ہوتا ہے اور دوسری مسلمات عموماً اس میں شامل ہیں:۔

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولیٰ (احزاب ۳۳)

اپنے گھروں میں قرار پکڑو اور نمائش نہ کرتی پھرو، جیسے کہ پہلے جہالت کے وقت میں نمائش کا رواج تھا۔

قرار و امساک میں فرق

قرار فی البیوت اور امساک فی البیوت کا فرق ملحوظ رہنا چاہئے۔ اول الذکر عورت کی رضا و اختیار سے متعلق ہے اور ثانی الذکر سخت سزا کے طور پر ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ قرار فی البیوت کا حکم اور تبرج الجاہلیہ کی نہی کو ساتھ ساتھ لانے کا مقصد یہ ہے کہ عورت کا مقرر مقام گھر کی چار دیواری ہے اور ضرورتاً باہر جانا پڑے تو نہایت سادہ لباس میں نمود و نمائش سے قطعاً پاک۔

آج کل جو برقعے ایجاد ہو رہے ہیں، وہ صاحبہ برقعہ سے زیادہ جاذب توجہ ہونے کی وجہ سے مقصد برقع سے بالکل عاری ہیں۔ شاید غالب نے ایسا ہی کوئی دل کش منظر دیکھ کر احتجاج کیا تھا ؎

"ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں"

اس مقصد کو آگے چل کر اور زیادہ واضح فرمایا ہے:۔

یاایھا النبی قل لازواجک وبناتک ونساء المومنین یدنین علیھن من جلا بیبھن

ذالک ادنیٰ ان یعرفن فلا یوذین (احزاب ۵۹)

اے نبی! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی چادریں اپنے اوپر ڈال لیں، اس طرح وہ غیر مسلم عورتوں سے ممتاز ہو سکیں گی اور ایذا رسانی سے بچ جائیں گی۔

سزائے ناہنجار

اس آیت کا پس منظر یا شانِ نزول خود اس آیت اور اگلی آیت سے ظاہر ہے کہ منافق اشخاص مسلمان عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے اور باز پرس پر کہہ دیتے کہ ہمیں کیا معلوم کہ وہ مسلمان ہیں جیسا کہ "یُعْرَفْنَ" اور "یُؤْذَیْنَ" سے معلوم ہوتا ہے۔ اگلی آیت بالکل صاف ہے:۔

لئن لم ینتہ المنافقون والذین فی قلوبھم مرض والمرجفون فی المدینۃ لنغرینک بھم ثم لا یجاورونک فیھا الا قلیلا ملعونین، اینما ثقفوا اخذوا وقتلوا تقتیلا۔ (احزاب ۔ ۶۰)

اگر اب بھی منافق، مریض القلب اور شہر میں بری خبریں پھیلانے والے باز نہ آئے تو ہم تجھے ان پر مسلط کر دینگے پھر وہ مدینے میں تیرے پاس رہنے نہیں پائیں گے، مگر تھوڑے دن۔

ان دو آیتوں کو یکے بعد دیگرے لانے میں حکمت عظیم رکھی گئی ہے۔ سورۂ نور میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ مرد کی تہذیب اخلاق پر عورت سے پہلے توجہ فرمائی ہے۔ یہاں عورت کو محتاط رہنے کے آداب سکھانے کے بعد اخلاق باختہ اور ناہنجار مردوں کی خبر لی گئی ہے۔ ایسے لوگوں کی تین قسمیں بتائی ہیں:۔

۱ —— تقدس فروش، زاہد نما منافق۔ ایسے عصمت ربا بزرگ ہر عہد میں بکثرت ملتے ہیں۔

۲ــــ مریض القلب۔ یہ قرآن مجید کی خاص اصطلاح ہے، جو جنسی اشتہا کی افراط کیلئے وضع ہوئی ہے، اگرچہ اس معنی میں محدود نہیں۔

۳ــــ شرفا کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے والے، عصمت مآب بی بیوں پر اتہام تراشنے والے۔

اگر یہ لوگ غض بصر، حفظ فرج اور تزکیہ اخلاق کے قرآنی قانون کی پابندی نہ کریں تو شریف سوسائٹی میں ان کیلئے کوئی جگہ نہیں۔ ان کا علاج یہ ہے کہ

۱ــــ اسلامی حکومت کے نزدیک نہ پھٹکنے پائیں۔ (لَا يُجَاوِرُونَكَ)

۲ــــ عزت و شرف کے مقامات سے دور دور رہیں۔ (مَلْعُونِينَ)

۳ــــ ان کو کھلے بھرنے اور ناجائز ارتکابات کا موقع نہ دیا جائے۔ (اُخِذُوا)

۴ــــ سوسائٹی میں ایسے متعدی جراثیم کو پھیلنے سے روکنے کیلئے ان کا قلع قمع کر دیا جائے۔ (قُتِّلُوا تَقْتِيلًا)

اب بتائیے ایسی سوسائٹی جس میں بدکاروں کا کلی خاتمہ زور حکومت سے کیا جائے، اگر اس میں حسن اخلاق اور شرافتِ نفس سے آراستہ عورتیں ذاتی یا قومی ضروریات کے ماتحت انسانیت کی خدمت انجام دیں، علم و تجارت میں حصہ لیں، داد شجاعت دیں اور صنعت و حرفت کو فروغ دیں تو اس میں ذرہ بھر قباحت کا بھی امکان ہو سکتا ہے؟ پردے پر بحث کرنے والوں کا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ بہت جلد ایسی سوسائٹی کی تعمیر پر زور دیں۔

عورتوں سے پردہ

ایک اور بات جس پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے، یہ ہے کہ جس طرح غیر مردوں سے پردہ کرنے کا حکم ہے، اسی طرح غیر عورتوں سے بھی کرنا لازم ہے۔ جیسا کہ احزاب کی آیت ۵۵ سے ثابت ہے۔ اس جگہ ان متعلقین کی فہرست ہے، جن سے پردے کی ضرورت نہیں، انہی میں "نِسَاءِهِنَّ" یعنی اپنی رشتہ دار شریف بیبیاں) بھی شامل ہیں۔ غیر عورتیں جن کا کیریکٹر غیر معلوم یا مخدوش ہے، شریف گھروں میں ان کے گھس آنے سے کئی طرح کے خطرناک نتائج نکلتے رہتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے روز اول ہی سے اس کی مناہی کر دی۔ سورۂ نور کی آیت ۳۱ بھی اس کی موید ہے۔

آواز کا پردہ

آج کل آپ کسی شریف گھر کے سامنے کھڑے ہو کر صاحب خانہ کو آواز دیں۔ اگر وہ یا کوئی بچہ یا نوکر گھر میں نہیں تو آپ لاکھ چیختے رہیں اندر سے کوئی آواز نہیں آئے گی۔ یہ چیز بھی داخل پردہ اور لازمہ شرافت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر میں ایسا "ملکوتی" پردہ کہیں نظر نہیں آتا۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

اذا سالتموھن متاعاً فسئلوھن من وراء حجاب، ذالکم اطھر لقلوبکم وقلوبھن (احزاب ۵۳)

جب تم (پیغمبر کی بیویوں) سے کوئی چیز مانگنے جاؤ تو پردے کے باہر سے مانگو، اس میں تمہارے اور ان کے دلوں کے لئے پاکیزگی ہے۔

اس میں دو سبق ہیں :۔

۱ـــــ مرد غیر عورت سے براہِ راست ضرورت کی چیز مانگ سکتا ہے۔
۲ـــــ پیغمبر کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں ہیں، اس پر بھی مسلمانوں کو پردے کے اندر جانے کی اجازت نہیں۔ اسی سورہ میں پہلے آچکا ہے:۔

یانساء النبی لستن کاحد من النساء ان اتقیتن فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض وقلن قولا معروفا (احزاب ۳۲)

اے ازواجِ نبیؐ اگر تم تقویٰ پر عمل پیرا رہو تو تم عورتوں میں سے کسی کی مانند نہیں ہو۔ سو تم دب کر بات نہ کرو ورنہ مریض القلب آدمی لالچ میں گرفتار ہو جائے گا اور معقول بات کہو۔

یعنی غیر مردوں سے بات کرو تو نرم اور دل کش لہجہ اختیار نہ کرو۔ عورت کی آواز میں قدرتی طور پر لوچ اور نزاکت ہوتی ہے۔ لیکن تقویٰ شعار عورتوں کو مناسب ہے کہ غیر مردوں سے گفتگو کرتے وقت بہ تکلف ایسا لہجہ استعمال کریں، جس میں قدرے خشونت اور روکھا پن ہو تاکہ کسی بدباطن آدمی کے لئے لغزشِ خیال کا موقع نہ پیدا ہو۔

خلاصۂ کلام

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے:۔

۱ـــــ پردہ ذریعہ فلاح اور موجبِ تطہیرِ قلب ہے۔ (نور ـ ۳۰ و ۳۱)
۲ـــــ زینت کے بعض خاص مقامات کے سوا باقی سب مستور رہنے چاہئیں۔ (نور ـ ۳۲)
۳ـــــ مغربی عریانی اور مشرقی شرفا کا مبالغانہ پردہ دونوں ہی غیر فطری اور غیر قرآنی ہیں (نور ۳۲ و نساء ۱۹)
۴ـــــ عورت کو سادہ لباس میں، چادر اوڑھے، کھلے چہرے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہے۔ (نور ـ ۳۲ ـ آل عمران ۴۲ و ۴۳ ـ مریم ۶ و ۲۹ ـ قصص ۲۳ تا ۲۹)
۵ـــــ عورت کا مستقل مقام گھر کے اندر ہے۔ (احزاب ۳۳)
۶ـــــ غیر مردوں اور غیر عورتوں سے اخفائے زینت کا یکساں حکم ہے۔ (نور ۳۱ ـ احزاب ۵۵)
۷ـــــ قرآنی حدود کے اندر پردے کا حکم ہے، لیکن کھلے چہرے باہر نکلنے کا کوئی حکم نہیں، صرف اجازت نکلتی ہے۔ دیکھو ۳ و ۴ کے حوالے۔
۸ـــــ عورت کو یہ اجازت دینے سے پہلے مرد کے دل و نگاہ کو مسلمان بنانا ضروری ہے (نور ۳۱)
۹ـــــ اخلاق باختہ مردوں کا مقام شرفا کی آبادیوں سے باہر ہے، یا ان کو سزا دی جائے گی جو قتل تک ہو سکتی ہے (۶۱)
۱۰ـــــ اسلامی پردہ عورت کو اپنی حفاظت، اظہارِ شجاعت، حصولِ علم و کمال اور صنعت و تجارت سے ہرگز نہیں روکتا۔ تلک عشرۃ کاملہ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اسلام کا نظریۂ جہاد؟

اقوامِ عالم کی تاریخ حرب کا نظریاتی پس منظر

(حکیم حیدر زمان صدیقی صاحب)

ماضی اور حال کی تاریخ حرب، قتل و غارت، جبر و قہر، غصب و نہب اور عالمگیر فتنۂ انسانیت کی ایسی المناک داستان ہے کہ اس کے تصور کے ساتھ ہی لاشوں کے پشتے، خون کی ندیاں، آگ کے سر بفلک شعلے، دھوئیں کے بادل، راکھ کے ڈھیر، عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار اور انسانی قساوتِ قلبی کے لاتعداد خوفناک مناظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں، اور اس سلسلہ میں ماضی اور حال کی تاریخ کچھ اس طرح باہم مربوط اور ہم آہنگ ہے کہ جو کچھ آپ ماضی کی داستان سرائی سے پا سکتے ہیں، حال کے مشاہدہ سے بھی آپ وہی کچھ پائیں گے۔ یعنی تاریخ کا ہر دور غارتگرانِ انسانیت کی خون آشامیوں اور ہلاکت آفرینیوں پر ماتم کناں ہے اور انسانیتِ معصومہ ہر زمانہ میں مرغِ بسمل کی طرح تڑپتی نظر آتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ تاریخِ انسانی کا یہ باب اتنا بھیانک، اتنا خوفناک اور اتنا شرمناک ہے کہ اس کے تصور ہی سے جگر شق ہونے لگتا ہے اور سرِ ندامت جھک جاتا ہے۔

جہاں تک امم سابقہ کا تعلق ہے قرآن کریم کے بیان کردہ تذکرۂ امم میں بہت سے ایسے حقائق کا پتہ چلتا ہے جن سے زمانۂ قدیم کی روش جنگ اور داعیہ ہائے قتال کا انکشاف ہو سکتا ہے اور اس کے علاوہ کتبِ تاریخ اور اثری انکشافات سے بھی ایک حد تک ان کا طرزِ معاشرت، نظامِ سیاست، طریقِ جنگ اور فوجی استحکامات کے نشانات مل سکتے ہیں۔ مگر یہاں ان کے طرزِ معاشرت اور طریقِ جنگ سے زیادہ ان کے نظریہ ہائے جنگ کی ٹوہ لگانا مقصود ہے۔ کیونکہ نظامِ معیشت و معاشرت ہو یا قانونِ سیاست و جنگ، اس کی تہ میں بلاشبہ وہ ذہنی کیفیت کارفرما ہوتی ہے جو خارجی نظام کے لئے علتِ مؤثرہ یا پس منظر (بیک گراؤنڈ) کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی خارجی شکل و ہیئت متعین کرتی ہے۔

جہادِ اسلامی جن بلند تر مقاصد کا حامل ہے ان کی عظمت کا حقیقی اعتراف اسی وقت ممکن ہے کہ اقوامِ دنیا کے نظریاتِ جنگ نظر کے سامنے ہوں۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ ماضی اور حال کے نظریہ ہائے جنگ

اور کشمکش اقوام کا پس منظر چند لفظوں میں پیش کر دیا جائے۔

انسانیت کے ابتدائی دور میں جو سب سے پہلی جنگ تسلیم کی گئی ہے وہ دو قوموں یا دو جماعتوں کی جنگ نہ تھی، بلکہ دو بھائیوں کی جنگ تھی اور قرآن کریم نے اس جنگ کے لئے حسد و رشک کو داعیہ قرار دیا ہے ایک بھائی حسد کے جنون میں از خود رفتہ ہو جاتا ہے اور اپنے بھائی کے خون سے ہاتھ رنگنا چاہتا ہے۔ اور دوسرا بھائی اتنا نیک نہاد، شریف النفس اور اصول پسند ہے کہ وہ اپنے بھائی پر جوابی حملہ کرنے سے بھی گریز کرتا ہے کہ یہ اس کے نزدیک گناہ عظیم ہے۔

لَئِنۡ بَسَطۡتَ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقۡتُلَنِیۡ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیۡکَ لِاَقۡتُلَکَ ۚ

اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ (المائدہ)

تو اگر مجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ بڑھانا چاہتا ہے (تو بیشک ایسا کر دیکھ) لیکن میں میرے قتل کے لئے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا۔ کیونکہ میں خدائے پروردگار عالم سے ڈرتا ہوں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ اب تک کسی نسلی یا جغرافی قومیت کی بنیاد نہ پڑی تھی اور نہ ہی کوئی مملکتی تصور معرض وجود میں آیا تھا بلکہ آدم علیہ السلام کی وفات سے طوفانِ نوح کے مشہور سانحہ تک یعنی قریباً ۷۲ سال کی طویل مدت میں جو کچھ ہوتا رہا وہ پردہ خفا میں ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس طویل عرصہ میں کوئی باقاعدہ مملکت قائم ہوئی تھی یا نہیں۔ مگر نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں کی اولاد سے مستقل نسلی اور جغرافی قومیتوں اور عظیم الشان قومی مملکتوں کی بنیاد پڑتی ہے۔

حضرت مسیح سے دو یا ڈھائی ہزار سال قبل دنیا کی بڑی بڑی اقوام کی نقل و حرکت اور مختلف قوموں کی باہم آویزش کے بہت سے واقعات ملتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ انسانی کا یہ دور معاشی کشمکش، ذہنی انتشار، آوارہ گردی اور طوائف الملوکی کا عجیب دور تھا اور اس عہد کی قوموں کا انتہائی مطمح نظر کسی وسیع و عریض اور سرسبز و شاداب خطۂ ارضی کا حصول تھا، یعنی ان اقوام کے نزدیک قلب و نظر کی شادابی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ مگر مقام و مسکن کی شادابی کے لئے ان کی رومان پسند نگاہیں مضطرب تھیں۔

چنانچہ اسی دور میں کچھ آریائی اقوام نے وسط ایشیا سے نکل کر اس برعظیم کا رُخ کیا جو اُن کی آمد کے بعد ہندوستان کے نام سے متعارف ہوا اور اس فاتح قوم نے یہاں کے قدیم باشندوں سے جو سلوک کیا اس کے مظاہر آج بھی ہماری نظر کے سامنے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انسانیت کی بربادی کی عارضی اور وقتی مثالیں سینکڑوں مل سکتی ہیں مگر ایسی مثال کہیں نہیں ملتی کہ انسانوں کی اتنی بھاری تعداد کو

لہ یہ حساب محض قیاسی ہے۔ (طلوع اسلام)

ابد الآباد کے لئے انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہو۔

مگر اس سلسلہ میں سب سے پہلے جن اقوام کا ذکر قرآن حکیم نے کیا ہے وہ امم سامیہ اولیٰ ہیں۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو قرآن کریم میں عاد اولیٰ کے نام سے موسوم ہوتی ہے اور عرب مؤرخین نے عرب بائدہ (ہلاک ہونے والے قبائل) اور عرب عاربہ (خالص عرب) کے ناموں سے ان کا ذکر کیا ہے۔ اور حقیقت میں یہی دنیا کی پہلی عظیم الشان قوم ہے جو اس دور میں ممالک عرب، صحرا، افریقہ، عراق، مصر، سیریا، ایران، قرطاجنہ (کارتھیج) کریٹ اور یونان پر فرماں روائی کرتی نظر آتی ہے۔ اس قوم کا اصل مسکن و مولد اگرچہ عرب تھا مگر عرب میں چونکہ وسائل معیشت کی فراوانی نہ تھی اس لئے یہ دلیر اور جنگجو قوم عرب سے نکل کر انسانی آبادیوں کو روندتی ہوئی دنیا کے اکثر ممالک پر چھا گئی۔ ان اقوام کا دور عروج دو ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے جبکہ یہ بابل، مصر اور دوسرے ایشیائی ممالک پر حملہ آور ہو کر عظیم الشان حکومتوں کی بنیاد ڈالتی ہیں۔ چنانچہ ابن خلدون لکھتے ہیں:۔

وکان لهذه الامم ملوك ودول فی جزیرة العرب واتسع ملکهم فیها الی الشام ومصر فی شعوب منهم (تاریخ ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۲۵۹)

ان اقوام میں بہت سے بادشاہ تھے اور جزیرہ عرب میں ان کی بڑی بڑی سلطنتیں تھیں اور ان کے چند قبائل کی وسعت مملکت مصر و شام تک پہنچ چکی تھی۔

قرآن حکیم نے زمانہ قدیم کی جن قوموں کا ذکر کیا ہے ان کے طرز جہانبانی اور طریق تمدن کو اس رنگ میں پیش کیا ہے کہ اس میں مدح و حسن کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ کہیں ان کے ظالمانہ طرز سیاست کے سیکڑوں واقعات کو چند الفاظ میں اس طرح سمیٹ دیا ہے کہ انسانی ہاتھوں کی لکھی ہوئی تاریخوں کے صدہا دفتر قرآنی زور بیان کے سامنے پھیکے نظر آتے ہیں[1] اور کہیں ان کی معیشت فاسدہ کی تباہ کاریوں کو اسی شان فصاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے[2]۔ مگر ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک مقصود بالذات تذکرہ نگاری نہیں ہے بلکہ ان جابر اقوام کے ذہنی پس منظر کو پیش کرنا ہے جس نے ان کی غلط سیاست کاری اور معیشت فاسدہ کو جنم دیا۔ چنانچہ عاد اولیٰ کی قوت و شوکت، جاہ و جلال، سیاست قاہرہ اور حملہ و ہجوم کے ظالمانہ طریق کو جس طرح بیان کیا ہے۔

---

[1] ان الملوك اذا دخلوا قریة افسدوها وجعلوا اعزة اهلها اذلة وکذلك یفعلون (آیہ)

[2] وکم اهلکنا من قریة بطرت معیشتها فتلك مساکنهم لم تسکن من بعدهم الا قلیلا (آیہ)

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ (۸۹)

آپ نے دیکھا نہیں عاد ارم سے آپ کے رب نے کیا سلوک کیا جو بڑی بڑی عمارتوں والی تھی اور جس کی مثال ممالک و بلاد میں نہیں پیدا کی گئی۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۝ (۴۱۔ السجدہ)

لیکن عاد نے ناحق طور پر زمین میں تکبر کیا اور کہہ دیا کہ ہم سے بڑھ کر طاقتور کون ہے؟

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۝ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ۝ (الشعراء۔۲۶)

اے عاد! تم ہر اونچی جگہ پر محض بے فائدہ یادگار اور عجیب و غریب مکانات بناتے ہو کہ شاید تم ہمیشہ زندہ رہو گے۔ اور جب تم کسی پر گرفت کرتے ہو تو جابر و قاہر بن کر گرفت کرتے ہو۔

ان قرآنی آیات سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان اقوام کا انداز فکر اور رجحان طبیعت کیا تھا اور ان کی سیاست و مدنیت کے بنیادی نظریے کیا تھے، نیز دوسرے ممالک پر ان کی فوج کشی، حملہ و ہجوم اور دیار و بلاد پر ان کے غلبہ و استیلا کے اصل دواعی کیا تھے۔ اور مفتوح اقوام سے ان کا سلوک کیسا تھا۔ ذیل میں ہم ان اقوام کے حملۂ مصر کا ایک تاریخی حوالہ پیش کرتے ہیں۔ عہد قدیم کا مورخ "مانیتھو" ان اقوام کے حملۂ مصر کے سلسلہ میں رقمطراز ہے:-

خدا ہم سے خفا تھا۔ ایک عجیب طریقہ سے یہ شریر الخلقت لوگ اطراف مشرق سے چلے آئے۔ وہ اس قدر بہادر تھے کہ وہ ہمارے ملک میں گھس گئے، نہایت آسانی سے بزور مسخر کر لیا، گو ان سے ہماری ایک قسمت آزما جنگ ہوئی۔ جب انہوں نے ہمارے سرداروں کو گرفتار کر لیا اور اپنی طاقت سے ہم پر حکومت کی۔ انہوں نے ہمارے شہروں کو جلا دیا، ہماری دیوتاؤں کے ہیکلوں کو برباد کر دیا۔

(بحوالہ ارض القرآن صفحہ ۱۴۸)

امم سامیہ اولیٰ میں سے جو قبائل عرب میں رہ گئے تھے اور انہوں نے عرب کے شمال میں عظیم الشان مملکت کی بنیاد ڈالی، وہ ثمود کے نام سے مشہور ہے۔ قرآن حکیم نے ان کی مسرفانہ زندگی، شوق تعمیر اور فساد فی الارض کا ذیل کے الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔

وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝

وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۝ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا
يُصْلِحُونَ ۝ (الشعراء۔ ۷)

اور کیا تم اتراتے ہوئے، پہاڑوں کو تراش تراش کر مکانات بناتے ہو۔؟ تم اللہ سے
ڈرو اور میری اطاعت کرو اور ان مسرفین کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد
کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

اقوام سامیہ اولیٰ کے بعد عرب مستعربہ کا دور آتا ہے جو اصل کے اعتبار سے عرب نہ تھیں مگر عاد اولیٰ کے زیر حکومت رہ کر انہوں نے عربی تمدن اختیار کر لیا تھا۔ اور بالکل عرب بن گئے تھے۔ اس طبقہ کا بانی یعرب ابن قحطان تھا۔ اور اس کا پایۂ تخت یمن تھا۔ اس کی نسل سے بہت سے خاندان یکے بعد دیگرے حکمران بنے۔ چنانچہ تبابعہ، سبا، اور حمیر کی عظمت شان اور قوت و شوکت کا قرآن حکیم میں کئی مرتبہ ذکر آیا ہے۔

أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ

کیا (قوت و شوکت میں) وہ (قریش) بہتر تھے یا قوم تبع ان سے بہتر تھی؟ ....

سبا کے متعلق ارشاد ہے۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَنَّتَانِ عَن يَمِينٍ وَشِمَالٍ ۖ
كُلُوا مِن رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ
غَفُورٌ ۝ (سبا)

سبا کے لئے ان کے اپنے مسکن میں نشانی تھی، یعنی دائیں بائیں دو باغ (جو کئی میلوں تک چلے گئے تھے)، (ان سے کہا گیا) کہ اپنے رب کا رزق کھاؤ اور اس کا شکر کرو۔
رہنے کے لئے پاکیزہ شہر ہے اور رب بخشنے والا۔

یہ اس قوم کی پہلی حالت تھی، جبکہ یہ عزت و جاہ اور وسائل معیشت کی کثرت کے لحاظ سے دنیا کی ممتاز ترین قوم تھی۔ مگر جب نشۂ دولت و حکومت نے اسے اندھا کر دیا تو اس کا بھی وہی حشر ہوا جو اس سے پہلے اس کی پیشرو قوموں کا ہوا تھا۔

وَظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (سبا)

سو انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا اور ہم نے ان کو (حقیقت سے) افسانہ بنا دیا
اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

سبا کے ایک طبقہ نے حبش میں سکونت اختیار کر لی۔ اور وہاں اس نے باقاعدہ مملکت بھی قائم کر لی تھی اور آگے چل کر سبا یمن اور سبا حبش میں سخت تباہ کن اور نسلی رقابت شروع ہو گئی۔

چنانچہ خاندانی تعصب کی وجہ سے ان دونوں میں مدتوں جنگ جاری رہی، مگر ایک عرصہ کے بعد سبا حبش نے عیسائیت قبول کر لی اور سبا یمن نے یہودی مذہب اختیار کر لیا اور اس طرح ان کی قدیم رقابت دو آتشہ بن گئی۔ چنانچہ سنہ ء سے چھٹی صدی تک ان کی باہم لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔

ان لڑائیوں کی تہ میں کون سے دواعی کارفرما تھے؟ اس کا اندازہ ان اقوام کے اعمالِ جنگ ہی سے کیا جاسکتا ہے، یعنی ان کی جنگوں میں نسلی اور قبیلوی تعصب کے علاوہ مذہب کا غلط تصور بھی کارفرما تھا۔ چنانچہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ذونواس شاہ یمن نے نجران کے کچھ عیسائیوں کو آگ کے گڑھے میں ڈھکیل دیا تھا۔ قرآن کریم نے بھی اس واقعہ کو اجمالی طور پر ذکر کیا ہے۔ (قتل اصحاب الاخدود النار ذات الوقود، (الآیہ) ظاہر ہے کہ ذونواس یہودی تھا اور مذہب کے غلط تصور نے اس کو اس حرکت پر آمادہ کیا تھا۔ اس واقعہ نے رومیوں میں سخت ہیجان پیدا کر دیا اور انہوں نے کالب الاصبح (شاہ حبش) کو آمادہ کیا کہ وہ یمن پر حملہ کرے۔ آخر ایسا ہی ہوا کہ شاہ حبش نے یمن پر فوج کشی کی۔ ذونواس مارا گیا اور شاہ حبش کا یمن پر بھی اقتدار قائم ہو گیا۔ مگر مذہبی تعصب ان میں بھی کچھ کم نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے باشندگان اکسوم کو اس شرط پر رہائی دی کہ وہ سب عیسائی ہو جائیں۔ اب ارباط نامی ایک شخص یمن کا پہلا گورنر مقرر ہوا اور اس نے بیس سال تک حکومت کی مگر آخر ابرہہ نامی ایک شخص کے ہاتھ سے قتل ہوا اور ابرہہ جو عیسائی تھا یمن کا مختار مطلق بادشاہ بن گیا، یہی وہ جابر بادشاہ تھا جس نے جناب آقائے دوجہان (صلعم) کی ولادت سے چالیس دن قبل مکہ معظمہ پر چڑھائی کی تھی۔ قرآن کریم میں اصحاب الفیل کے نام سے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مشہور واقعہ کا اصل محرک خواہ کوئی ملکی اور سیاسی مصلحت ہو خواہ کچھ اور مگر اس میں شک نہیں کہ کعبۃ اللہ کی قدیم تاریخی عظمت اس عیسائی بادشاہ کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ اسی مقصد کے لئے یمن صنعا میں بہت بڑا کنیسہ تعمیر کرایا تھا جس کا نام اس نے کعبہ رکھا تھا۔ غرض ان اقوام کا قومی مذاق اور اجتماعی شعور امم سامیہ اولیٰ سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا اور ان کے مقاصد جنگ بھی کم و بیش ان کے لگ بھگ تھے۔ البتہ ان میں قبیلوی اور نسلی رقابت کے ساتھ مذہبی تعصب بھی نمایاں نظر آتا ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں بابل کی ایک بہت بڑی سلطنت کا پتہ چلتا ہے جس کا حکمراں نہایت سرکش اور متمرد انسان تھا۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ انسانوں کی زندگی اور موت میرے قبضۂ اختیار میں ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک جابر حکمران مصر کی سلطنت پر قابض نظر آتا ہے جس نے اپنا طاغوتی تخت ہزار ہا بے گناہ انسانوں کی لاشوں پر بچھایا تھا۔ قرآن حکیم میں ان حکمرانوں اور ان اقوام کا جن پر یہ حکمرانی کرتے تھے کئی مرتبہ ذکر آیا ہے۔ اور کہیں کہیں

ان کے طرزِ فکر اور اصولِ صلح و جنگ کا بھی انکشاف کیا ہے۔ چنانچہ فرعون مصر کی حاکمانہ حکمتِ عملی کے سلسلہ میں قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ اس کی جد و جہد کا مقصد اپنے فرقہ یا قوم کی سربلندی، دوسرے فرقوں کی تذلیل اور اپنی جھوٹی خدائی کا تحفظ تھا۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ (۲۸:۴)

فرعون نے زمین میں تکبر کیا، اور اس کے رہنے والوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، کہ ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کرنا چاہتا تھا۔

قرآن حکیم میں بنی اسرائیل کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اس قدر بسط و تفصیل کے ساتھ کسی دوسری قوم کے حالات نہیں بیان کئے گئے جس قدر اس قوم کے بیان کئے گئے ہیں۔ اور حقیقت میں یہی وہ قوم ہے جس کو یکجا نبوت اور حکومت کے جلیل القدر مناصب ایک عرصہ تک حاصل رہے۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا عہد ان کی قومی زندگی کا عہدِ شباب تھا۔ اور لطف یہ ہے کہ حضرت موسیٰ سے لیکر حضرت مسیح تک کے درمیانی عرصہ میں کوئی نہ کوئی اللہ کا بھیجا ہوا نبی ان کے اندر موجود رہا۔ مگر حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود ان کے قومی مزاج اور ملی شعور میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ چنانچہ مصر سے نکلنے کے بعد موسیٰؑ نے ان کو وہ وعدہ خداوندی یاد دلایا جو خدائے قدوس نے حضرت ابراہیمؑ سے کیا تھا کہ میں تیری نسل کو شام و فلسطین میں غلبہ و تمکنت عطا کروں گا۔ اور پھر موسیٰؑ نے ان سے جرأت و دلیری سے آگے بڑھنے کا مطالبہ کیا مگر اس قوم نے یہ جواب دیا۔

يَا مُوسَىٰ إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ وَإِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِن يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ٥ (المائدہ-۳)

اے موسیٰ اس سرزمین میں ایک جابر قوم رہتی ہے۔ اور ہم ہرگز اس میں داخل نہ ہوں گے تاوقتیکہ وہ قوم وہاں سے نکل نہ جائے۔ پس جب وہ وہاں سے نکل جائیں گے تو ہم اس زمین میں داخل ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ انبیاء و رسل کے فلسفۂ زندگی کو ماننے والے لوگ زندگی کا ایک ہی مقصد رکھتے ہیں جو ان کی جان عزیز سے ہزار درجہ زیادہ ان کی نظر میں عزیز ہوتا ہے۔

مقصدے از آسماں بالاترے
دلربائے دلستانے دلبرے

لیکن بنی اسرائیل کا شعور ملی اس درجہ تک پہنچا ہی نہ تھا کہ وہ حیاتِ جاوید اور اصولِ انسانیت کیلئے اپنی جانیں قربان کرتے اور جامِ شہادت میں اپنے ضمیرِ مردہ کے لئے حیاتِ تازہ کی تلاش کرتے۔

من یہن یسہل الہوان علیہ　　　ما لجرح بمیت إیلام

تین وحشیانہ حملے

خدائے قدوس نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل سے کہدیا تھا کہ تمہاری معصیت و فساد کی وجہ سے تم پر قہر الٰہی نازل ہوگا اور تمہاری قومی ہستی کو ختم کردیا جائے گا۔ مگر دو مرتبہ تمہیں پھر ابھرنے کا موقعہ دیا جائے گا۔

پہلا حملہ وہ ہے جبکہ عمالقہ نے بنی اسرائیل کا سیاسی اقتدار ختم کردیا تھا اور ان کو ان کے دیار و اموال سے نکال دیا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ قرآن حکیم نے اس واقعہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا

ہمیں کیا ہوا ہے کہ اللہ کی راہ میں ہم نہ لڑیں گے۔ حالانکہ ہمارے دشمن نے ہم کو گھر بار (البقرہ)

اور اولاد سے جدا کردیا ہے۔

دوسرا حملہ بابل کے مطلق العنان بادشاہ بخت نصر کا ہے جبکہ اس کی افواج قاہرہ نے یہود کے مرکز دینی یعنی بیت المقدس پر یلغار کی، یہود کا قتل عام کیا، شہر کو ویران کردیا، یہاں تک کہ ان کے مقدس معابد اور ہیکل سلیمانی کو برباد کردیا اور قتل عام سے جو لوگ بچ گئے ان کو گرفتار کرکے بابل لیجایا گیا۔ جہاں وہ مدتوں مقید رہے۔

تیسرا حملہ، شہنشاہ روم ٹیٹس نے بیت المقدس پر کیا تھا اور یہ حملہ اتنا شدید اور فیصلہ کن تھا کہ اس نے یہود کی ہزار سالہ عظمت قومی کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا اور اس کے بعد وہ سیاسی لحاظ سے کبھی نہ اٹھ سکے۔ یہ سنہء میں ہوا تھا۔

قرآن حکیم نے پہلے دو حملوں کا صراحت سے ذکر کیا ہے۔ مگر تیسرے حملہ کے متعلق محض اشارہ پر اکتفا کیا ہے۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ
وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ۝ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا
أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا (بنی اسرائیل)

ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل کے بارے میں یہ فیصلہ کردیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد کروگے۔ اور پھر بہت بڑی بلندی پر پہنچ جاؤ گے۔ پس جب ان دو وعدوں میں سے پہلے وعدہ کا وقت آیا تو ہم نے سخت جنگجو لوگوں کو تم پر بھیجدیا۔ پس وہ شہروں کے اندر گھس گئے اور یہ وعدہ پورا ہو کر رہا۔

اس تباہی کے بعد بنی اسرائیل کو دشمن پر سیاسی اقتدار حاصل ہوا۔ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ (الآیۃ) لیکن جب دوسرے وعدے کی تکمیل کا وقت آیا تو ایک دوسری قوم نے حملہ آور ہو کر قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔

کیا گیا ہے اور اس کی مثال انیسویں اور بیسویں صدی کی ہولناک جنگوں کو چھوڑ کر شاید پوری انسانی تاریخ میں مشکل ہی سے دستیاب ہو سکے گی۔ چنانچہ عیسائیت اور یہودیت کی باہم مذہبی منافرت کا نتیجہ تھا کہ اس دور میں عیسائی سلطنتوں کے ہاتھوں یہودیوں کو جن لرزہ انگیز مظالم کا شکار ہونا پڑا ان کا تصور بھی ایک انصاف پسند انسان کے لئے سخت مشکل ہے، بلکہ خود عیسائیوں کا یعقوبی فرقہ برسرِاقتدار طبقہ کے مظالم سے چلا اٹھا تھا اور یہی وجہ تھی کہ خدا کی اس مظلوم ترین مخلوق نے اسلامی فاتحین کا جوش مسرت سے استقبال کیا اور مسلمانوں کے ساتھ ہو کر اپنے ہم مذہب عیسائیوں سے لڑائی کی۔ چنانچہ قاضی ابو یوسف اپنی مشہور عالم کتاب "کتاب الخراج" میں تحریر فرماتے ہیں:-

فلما رأى اهل الذمة وفاء المسلمين وحسن السيرة فيهم صاروا

اشداء على عدو المسلمين وعونا للمسلمين على اعدائهم

جب ذمیوں نے مسلمانوں کا ایفاءِ عہد اور حسنِ اخلاق دیکھا تو وہ اعداءِ مسلمین کے مقابلہ میں

مسلمانوں کے معاون و مددگار بن گئے۔

عربِ جاہلیت کے تصوراتِ جنگ

اسلام کا ظہور سب سے پہلے عرب میں ہوا اور عربوں ہی کے ذریعہ یہ دنیا میں پھیلا، اس لئے یہ دیکھنا از حد ضروری ہے کہ جن لوگوں نے قبولِ اسلام کے بعد پوری دنیا میں ایک ہمہ گیر ذہنی اور سیاسی انقلاب پیدا کیا وہ اسلام لانے سے قبل کیا تھے؛ یعنی ان کی ذہنی اور فکری صلاحیتیں کس نوعیت کی تھیں، اور جنگ و قتال کے سلسلہ میں ان کے نظریے کیا تھے اور اسلام کے بعد ان کے تصوراتِ حرب اور شعورِ ملی میں کس طرز کی تبدیلی رونما ہوئی۔

جہاں تک بعد از اسلام ان کے نظریۂ زندگی اور تصورِ حرب کا تعلق ہے وہ کتاب و سنت سے معلوم کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان کی پوری زندگی پر کتاب اللہ اور سنتِ نبوی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ آئندہ مباحث میں اس پر تبصرہ کیا جائے گا۔ لیکن اس موقع پر عربِ جاہلیت کے تصوراتِ جنگ معلوم کرتے ہیں۔

عربِ جاہلیت میں فنِ تاریخ نگاری رواج نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اس دور کے واقعات کسی تاریخ میں منضبط نہیں ہیں۔ البتہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اہلِ عرب فطری طور پر سخت جنگجو اور دلیر واقع ہوئے تھے۔ ان میں مسلسل جنگیں جاری رہتی تھیں۔ یہ لوگ ان قبیلوی جنگوں میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھاتے تھے اور پھر اپنے جنگی کارناموں، شجاعت و بسالت، قومی تفاخر اور اعمالِ حرب کا اظہار اشعار کے ذریعہ کرتے تھے۔ اس بنا پر اس قوم کے ذخیرۂ شعر و ادب ہی کو تاریخی سرمایہ تصور کیا جا سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قوم میں بے شمار خفی صلاحیتیں موجود تھیں اور یہی وجہ ہے کہ خدائے قدوس نے

عالم انسانی کی اصلاح اور اس کی قیادت و امامت کے لئے اسی قوم کو چنا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام سے پہلے اس قوم کے پاس کوئی اخلاقی ضابطہ نہ تھا جو ان کی قیمتی صلاحیتوں اور اعلیٰ صفات میں رفق و اعتدال اور نظم و انضباط پیدا کرتا۔ اس بنا پر اس قوم کی تمام اعلیٰ صلاحیتیں اصلاح انسانیت کے بجائے تخریب انسانیت پر صرف ہوتی تھیں۔ جیسے غذا کا اصل مقصد جسم کا حفظ و بقا ہے۔ مگر اس کا غلط طریق استعمال جسم کی تباہی کا باعث ہو سکتا ہے، بالکل اسی طرح جود و سخا، شجاعت و تہور، خود داری اور شرف النفس، وہ صفات ہیں جو اہل عرب کے خمیر میں داخل تھیں۔ مگر ان کی یہ صفات امن و اصلاح کے بجائے شر و فساد کے لئے وقف تھیں۔ چنانچہ ان کی باہم قبیلوی لڑائیاں مسلسل رہتی تھیں اور ان لڑائیوں میں جس طرح کے وحشیانہ اور اخلاق سوز افعال کا ارتکاب کیا جاتا تھا ان کے تصور ہی سے دنیا کانپ اٹھتی ہے۔

غرض اہل عرب کے ادبی لٹریچر سے جو بیشتر ان کے جنگی کارناموں پر مشتمل ہے ان کے مقاصد جنگ معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ اور ان کے ایک ایک شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی لڑائی کے محرکات، قومی حمیت، نسلی عصبیت، جذبۂ انتقام اور شوق غنیمت ہیں۔ چنانچہ ایک شاعر اپنا مقصد جنگ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے

انی لمن معشر افنی اوائلہم قیل الکماۃ الا این المحامونا

میں اس گروہ سے تعلق رکھتا ہوں جس کے سردار بہادروں کی اس پکار پر "ہاں قبیلہ و نسب کو بچانے والے کہاں ہیں" اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لیتے ہیں۔

ان کے جذبۂ انتقام کا یہ حال تھا کہ ایک شاعر اپنے قبیلہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

وما مات منا سید حتف انفہ ولا طل منا حیث کان قتیل

ہم میں سے کوئی سردار ناک کے بل نہیں مرا اور ہمارے کسی مقتول کا خون رائگاں نہیں گیا

اور ان کے شوق غنیمت کا یہ حال تھا کہ ضرورت پڑنے پر اپنے بھائیوں پر بھی چڑھائی کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر لکھتا ہے۔

واحیانا الی بکر اخینا اذا ما لم نجد الا اخانا

اور بہت دفعہ ہم اپنے بھائیوں یعنی بنی بکر پر حملہ کر دیتے ہیں۔ جبکہ اپنے بھائی کے سوا ہم کسی دوسرے کو نہیں پاتے۔

جنگ کے موقعے پر یہ لوگ جس طرح کے شرمناک افعال کا ارتکاب کرتے تھے اس کی ایک مثال ذیل کے شعر میں ملاحظہ ہو۔

لعمرنا الحبالی من شنوءۃ بعد ما خبطنا بخیف الریح نہرا ودخعما

ہم نے جوش میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چیر ڈالے ، جبکہ ہم خیف الریح میں نہد اور خثعم
پر غلبہ پا چکے تھے ۔

اور ایک دوسرا شاعر اپنا مقصدِ جنگ ان الفاظ میں واضح کرتا ہے ۔

فالھم بیبضات الخدود　　رمضائك لا النعم المراح

میدانِ جنگ میں ہمارا مقصد پردہ دار سفید فام عورتیں ہوتی ہیں ، نہ کہ چراگاہ سے واپس
آنے والے اونٹ

یہ ہے عرب جاہلیت کے مقاصدِ جنگ کا اجمالی خاکہ ۔ مگر اسلام کے بعد ان کے طبائع میں جو حیرت انگیز انقلاب پیدا ہوا وہ اسلامی تاریخ سے معلوم کیا جا سکتا ہے ۔ ان کے زمانۂ اسلام کا ذخیرۂ ادب بھی ان کے مقاصدِ جنگ کو آشکارا کرتا ہے ۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن رواحہ کے دو شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ۔ یہ شعر انہوں نے اس وقت کہے تھے جبکہ وہ آنحضرت کی رکاب تھامے فاتحانہ انداز میں مکہ میں داخل ہو رہے تھے ۔

خلوا بنی الکفار عن سبیلہ　　خلوا فکل الخیر فی رسولہ

اے کفار کے بیٹو ! راستہ چھوڑ دو　　ہٹ جاؤ ۔ پس ساری بھلائی اللہ کے رسول میں ہے

قد انزل الرحمن فی تنزیلہ　　بان خیر القتل فی سبیلہ

خدا نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا ہے　　کہ بہترین جنگ وہ ہے جو اللہ کی راہ میں ہو

اُمَمِ سابقہ اور اقوامِ حاضرہ کا نقطۂ اتصال

فسادِ انسانیت کا حقیقی داعیہ

عہدِ قدیم اور عہدِ جدید میں ظواہر کے اعتبار سے کتنا ہی تفاوت کیوں نہ ہو مگر اس امر کا انکار حقیقت کا انکار ہوگا کہ تاریخ انسانی کے ہر دور میں مابعد الطبیعی تصورات اور ہمہ گیر اصولِ اخلاق کے خلاف انسان کو آمادۂ بغاوت کرنے والے محرکات قریب قریب یکساں رہے ہیں ، یعنی تخریبی عواطف و جذبات کی اصل روح ہر زمانہ میں ایک ہی رہی ہے ، اگرچہ اس کی تعبیر و اظہار کے طریقے زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں ۔ اس لئے یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ شر و فساد کے ناپاک منصوبوں کی اصل روح آج بھی وہی ہے جو آج سے کئی ہزار سال قبل تھی ، اگرچہ ہر زمانہ میں کسی نئے رنگ اور نئے لباس میں ظاہر ہوتی رہی ہے ۔

یہ داعیۂ فساد کیا ہے ؟ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ انسانی جماعت جس وقت شرفِ انسانی کے

بلند تر مقاصد اور انسانیت مطلقہ سے تعلق رکھنے والے اصول اخلاق کو چھوڑ کر شخصی، گروہی اور طبقاتی اغراض و مصالح میں منہمک ہو جاتی ہیں تو ان کے معاشی اور معاشرتی زاویہ ہائے فکر کلیتہً بدل جاتے ہیں اور آگے چل کر ان کا پورا معاشرہ اور زندگی کا نقطۂ نظر ایک نئی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اب یہ نیا معاشرہ جو محض لادینی اور مادی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے اس کی اصل فطرت ہی صدہا مفاسد انسانی کا سرچشمہ ہوتی ہے، شلاً دہر پرستی، معاشی برتری کا جذبہ، وطنی، نسلی اور قبیلوی عصبیت اور اس قسم کے تمام انسانیت کش اور اخلاق سوز رجحانات اسی ایک داعیہ فساد کی پیداوار ہیں۔ اگرچہ آج جمہوریت و مساوات کے علمبرداران کو اصل مرض سمجھ کر ان کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مستقل مرض نہیں ہیں بلکہ علاماتِ مرض ہیں۔ اصل مرض جیسے کہ عرض کیا گیا ہے "اقوامِ حاضرہ کا مصالح کلیہ اور بہمہ گیر اصول انسانیت سے اغماض اور اغراض جزئیہ میں انہماک ہے۔

قرآن حکیم نے ان اغراض جزئیہ کو بہت سی اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے۔ کسی جگہ ان کے لئے "شَہَوَاتٌ وَّ اَھْوَاءٌ" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اور کہیں عرض ھذا الادنیٰ کا ان پر اطلاق کیا گیا ہے۔ اور سورۂ انعام میں اسی مفہوم کو تزئینِ شیطانی سے تعبیر کیا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ (انعام)

ہم نے پہلی قوموں کی طرف رسول بھیجے، (انہوں نے رسولوں کی دعوت کو نہ مانا) پس ہم نے تنگدستی اور مرض سے ان کو پکڑا تاکہ وہ عاجزی اختیار کریں۔ پس ایسا کیوں نہیں ہوا کہ جب ان پر ہمارا عذاب نازل ہوا تو وہ جھک جاتے، مگر ان کے دل سخت ہو گئے تھے اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظروں میں خوبصورت بنا دیا تھا پس جب وہ نصیحت خداوندی کو بھول گئے تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ ہماری دی ہوئی نعمتوں پر اترانے لگے تو ہم نے ان کو ناگہاں پکڑ لیا پس وہ ناامید ہو کر رہ گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی تباہی کے جتنے مناظر آج تک دیکھے گئے ہیں وہ اسی ضلال قدیم

یا تزئین شیطانی کے مظاہر میں کہ جس چیز پر سب سے زیادہ توجہ دینی چاہیئے تھی اس کو نظر انداز کیا جا رہا اور جو چیز اصل مقصد حیات کے اعتبار سے محض ضمنی اور ثانوی حیثیت رکھتی ہے اس کو مقصود بالذات بنایا جا رہا ہے۔ اور صرف اسی وجہ سے ان کی زندگی فساد و اختلال سے دوچار ہوتی رہی ہے۔

مرشد رومی حکیم پاک زاد سر مرگ امتاں بر ما کشاد
ہر ہلاک امت پیشیں کہ بود زانکہ بر جندل گماں بردند عود

(پیام مشرق)

ظاہر ہے کہ جب اس غیر فطری اساس فکر پر کسی معاشرۃ انسانی کی تعمیر ہوگی تو وہ اصل فطرت اور طبیعت کے اعتبار سے صدہا مفاسد کو اپنے اندر لئے ہوئے ہوگا۔ یعنی وحشت و بہیمیت، ظلم و تعدی، غصب حقوق انسانی نامساوات، خود غرضی اور اس طرح کی تمام بلائیں اس کے اندر موجود ہوں گی۔ اب اس فاسد معاشرہ کی وجہ سے نسل انسانی ہمہ گیر شورش و بدامنی سے دوچار ہوتی ہے تو اس کا الزام کسی خارجی قوت پر ہرگز نہیں تھوپا جا سکتا۔ بلکہ یہ اس جدید معاشرہ کی فطرت کا اقتضا ہے۔ اور ایسی قوم کو بربادی و ہلاکت سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ وکان امر اللہ مفعولا

ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالاً الذین ضل سعیھم فی الحیوۃ الدنیا
وھم یحسبون انھم یحسنون صنعاً (آیۃ)

کیا ہم آپ کو ان لوگوں کی حالت بتائیں جو اعمال کے لحاظ سے خاسر و نامراد ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی جد و کوشش صرف حیات دنیوی میں گم ہو گئی ہے۔ اور وہ یہی سمجھ رہے کہ ہم اچھا کام کرتے ہیں۔

گذشتہ سطور میں یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ امم سابقہ اور اقوام حاضرہ کے حیاتیاتی نقطہ ہائے نظر میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اس بنا پر اقوام حاضرہ کی قومی جد و جہد یا جنگ و قتال کا ذہنی پس منظر معلوم کرنا بالکل آسان ہو جاتا ہے۔ یعنی شدید قومی اور نسلی تعصب، غلبہ و تسلط کا جنون اور معاشی برتری کی خواہش یہی وہ محرکات ہیں جو اقوام حاضرہ کو جنگ پر آمادہ کرتے ہیں اور کوئی اصولی یا الہیاتی مقصد ان کی نظر کے سامنے نہیں ہے۔

آج ہر قوم کا محور عمل اس کی خود ساختہ قومیت و نیشنلزم ہے۔ اور اس قومیت کا تحفظ ہی اس کا آخری نصب العین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جنگوں میں انسانیت و شرافت اور اخلاق کی جس طرح مٹی پلید کی جاتی ہے، اس کی مثال کسی بدترین دور وحشت میں بھی نہیں مل سکتی۔ آج دنیا کی ہر قوم

علمبردار خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء و رسل ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان دو گروہوں کا اختلاف کوئی معمولی اختلاف نہیں کہ ان کے نقطہ ہائے نظر میں معمولی ردو بدل یا اصلاح و ترمیم کے بعد اتحاد ہو سکے، بلکہ ان میں شدید نظری اور اصولی اختلاف ہے اور جب تک ان میں سے کوئی ایک اپنا مقام چھوڑ نہ دے اس وقت تک وہ دوسرے کے ساتھ کسی شکل میں نباہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ان دو گروہوں کو متناقض ناموں سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ کسی جگہ حزب اللہ اور حزب الشیطان کے الفاظ سے ان گروہوں کے تضاد مطلق کو عیاں کیا گیا ہے کہیں امنوا اور کفروا سے ان کے نظری اختلاف کو ظاہر کیا ہے، کہیں متقین اور فجار کی جامع اصطلاحوں سے ان کے عمل و کردار اور اخلاق و سیرت کے تفاوت کو واضح کیا ہے اور کہیں خیر البریہ اور شر البریہ سے ان کے ایمان اور کفر کے نتائج کو واشگاف کر دیا گیا ہے۔

نیز جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے ان دونوں گروہوں کا باہم تصادم کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے اور نہ ہی تاریخ کے کسی ایک دور سے مخصوص ہے بلکہ بدء الخلق سے شر و فساد کی طاغوتی طاقتیں سادہ لوح انسانوں کو پُر فریب اور خطرناک عیاریوں سے گمراہ کرتی رہی ہیں اور ان کے مقابلہ میں ربانی دعوت و اصلاح نے بھی ہمیشہ اپنا کام جاری رکھا ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ چنانچہ شیطانی گروہ کا کام ہے انسانیت کی تخریب اور بغی و فساد! یعنی انسانوں کو ہمہ گیر اصول انسانیت، الہیاتی تصورات اور مصالح عامہ سے ہٹا کر گروہی اور جزوی مفادات کی طرف مائل کرنا اور اس کے بالکل برعکس خدائی گروہ کا کام عام انسانوں کو تخریب و فساد کی راہ سے ہٹا کر فکر و عمل کی راہ مستقیم اور انسانیت کی غایت مقصوی کی طرف لیجانا ہے۔ اور چونکہ ان دونوں گروہوں کے مقاصد میں بنیادی طور پر تضاد پایا جاتا ہے اس بناء پر ان میں باہم تصادم بھی ناگزیر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ دعوت حقہ جو اس خدائی گروہ یعنی انبیاء و رسل اور ان کے نائبین کی طرف سے ہوتی رہی ہے ایک ازلی دعوت ہے اور عام اصطلاح میں اسی کا نام اسلام ہے۔ یعنی تاریخ کے ہر دور میں جس قدر داعی اور مصلح پیدا ہوئے انہوں نے عام انسانوں کو اسلام ہی کی دعوت دی اور ان کا مقصد فقط یہ تھا کہ انسانوں کو افراط و تفریط اور بغی و فساد کی راہوں سے ہٹا کر راہ عدل کی جانب ان کی رہنمائی کریں۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (سورہ حدید)

ہم نے اپنے رسولوں کو معجزات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ہمراہ کتاب اور میزان بھی نازل کی

تاکہ لوگ نقطۂ عدل پر کھڑے ہو جائیں۔

اسلام درحقیقت دین فطرت کا دوسرا نام ہے اور اس کا اولین اقتضا یہ ہے کہ انسانی جماعت میں جس قدر غیر فطری عوامل کارفرما ہیں ان کی ایک خاص الہامی اسلوب دعوت کے ذریعہ اصلاح کی جائے یعنی ان کے فکر و ذہن اور عمل و کردار میں ایک مقدس انقلاب پیدا کیا جائے جس سے ان کی پوری زندگی پاکیزہ بے ضرر اور پرامن زندگی بن جائے۔ نہ کوئی حاکم ہو نہ محکوم، نہ اعلیٰ ہو نہ ادنیٰ، نہ اشرف ہو نہ ارذل، نہ مظلوم ہو نہ ظالم اور نہ بندہ ہو نہ آقا! غرض انسانی عزو شرف کے جتنے خود ساختہ معیار ہیں ان کو یکسر ختم کر دیا جائے اور تمام انسانوں کو ایک ہی ہمہ گیر رشتۂ اخوت انسانی میں منسلک کر دیا جائے۔ حاکمیت ہو تو صرف احکم الحاکمین کی، اور قانون ہو تو اسی کا: اور تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہوں اور خدا کے وفادار بندے!

کونوا عباد اللہ اخوانا (بخاری)

تم اللہ کے عبادت گزار بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ

یہ ہے اسلام کی دعوت! اور اس معصوم و مقدس دعوت کی راہ میں جو جد وجہد کی جاتی ہے خواہ وہ زبان و قلم سے ہو یا جنگ و قتال سے اس کا نام اسلامی اصطلاح میں "جہاد" ہے۔ اس بنا پر یہ دعویٰ یقیناً حق بجانب ہوگا کہ جس طرح دین فطرت ایک ازلی نظام حیات ہے، اسی طرح اس کو بروئے کار لانے کے لئے جو سعی و کوشش عمل میں لائی جاتی رہی ہے وہ بھی ایک قدیم حقیقت ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ لفظ جہاد ایک قرآنی اصطلاح ہے اور اس کی ابتدا نزول قرآن ہی سے مانی جا سکتی ہے۔ مگر جہاں تک اس کی معنویت اور حقیقت کا تعلق ہے وہ انسانیت کی توام ہے یعنی انسانی تاریخ کی ابتدا اس کی ابتدا ہے۔ اور اس کا سلسلہ آئندہ بھی تا قیامت جاری رہیگا۔

لا تزال طائفۃ من امتی یقاتلون علی الحق (رواہ ابوداؤد)

میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق کے لئے لڑتا رہے گا۔ ....!

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ یہ جہد مقدس اور سعی مسلسل کسی جزوی مقصد کے لئے نہیں ہے اور اس کا ذہنی پس منظر کسی ایک نسلی یا جغرافی قوم (نیشن) کی سربلندی نہیں ہے بلکہ نفس انسانیت کی فلاح و نجات ہے۔ یعنی اسلام انسانی دنیا کو ایک ایسے بے ضرر اور صالح نظام تمدن سے روشناس کرتا ہے جس کی بنیاد مصالح کلیہ، مابعد الطبیعی تصورات اور ہمہ گیر اخوت بشری پر ہے۔ اور ان

اخلاقی اور الٰہیاتی تصورات کو انسانی سوسائٹی کے ہر شعبہ میں اساسی درجہ حاصل ہے۔ اس بنا پر اسلامی معاشرہ اپنی طبیعت اور فطرت کے اعتبار سے کائنات انسانی میں رشتۂ اخوت پیدا کرتا ہے اور جس نظریۂ زندگی پر اس معاشرہ کی تعمیر ہوتی ہے وہ ایک ہمہ گیر صداقت (یونیورسل ٹروتھ) اور نوع انسانی کا مشترکہ نصب العین ہے جو کسی ایک انسانی فرقہ یا گروہ سے کسی طرح کا اختصاص نہیں رکھتا۔ اس بنا پر اسلامی معاشرہ میں کسی طرح کے گروہی اور طبقاتی تصادم (سیکشنل وار) کا امکان نہیں ہے بلکہ اس معاشرہ میں تمام بین الاقوامی مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں اور جہاد در اصل اسی معاشرہ کے قیام کے لئے تعمیری جد وجہد ہے۔ مگر چونکہ یہ تعمیر، تخریب کے سوا کسی طرح ممکن نہیں ہے اس لئے اسلام نے حکم دیا ہے کہ پہلے فاسد معاشرہ انسانی اور غیر الٰہی نظام تمدن کو ختم کیا جائے اور اس کے بعد ایک صالح معاشرہ اور جدید نظام تمدن کی بنیاد ڈالی جائے۔ لہٰذا جہاد اسلامی پر اگر غیر متعصب نظر سے غور کیا جائے تو یہ تعمیر انسانیت کا ایک مہتم بالشان عمل ہے جس کے بغیر کائنات انسانی امن و مساوات، حق و صداقت، ایمان و عمل بلکہ انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم رہ جاتی ہے اور شر و فساد کی شیطانی طاقتوں کو پھلنے پھولنے اور ابھرنے سے کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (انفال)

فلاحِ انسانیت اور جہاد

غیر مسلم اہل قلم نے اسلامی جہاد کو کچھ ایسے خوفناک انداز میں پیش کیا ہے کہ ہر وہ شخص جو جہاد کی اصل حقیقت سے واقف نہ ہو ان کی تحریروں کو پڑھ کر لرزہ براندام ہو جاتا ہے اور وہ لازمی طور پر اسلام کو ایک وحشیانہ مذہب اور اہل اسلام کو ایک ظالم اور وحشی قوم تصور کرنے لگتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے نہ کبھی اسلام کے فلسفۂ اجتماع کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی ان کی قومی اور سیاسی مصلحتوں نے ان کو کبھی اس کی اجازت دی ہے، بلکہ آج تک ان کی یہ طے شدہ حکمت عملی رہی ہے کہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے جو کچھ ممکن ہو کر گذرنا چاہئے، خواہ اس میں حق و صداقت اور دیانت و شرافت کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ ایک قوم کو دوسری قوم کے خلاف ابھارنے میں انہوں نے ہمیشہ اسی ذلیل ہتھیار کو استعمال کیا ہے اور آج بھی ان کے اس طرز عمل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ آج تو ان کے ہندوستانی شاگردانِ رشید کو بھی ان کی نگاہ ناز نے اس درجہ تک پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنے قومی مسائل میں ہر طرح کی دیانت اور اخلاقی قدروں سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ اور گذشتہ ایک سال میں انہوں نے جس طرح انسانیت و اخلاق

کی ہی پلید کی ہے اس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ آنے والی نسلیں ان کے بھیانک کردار پر ماتم کریں گی۔

غرض اہل مغرب کے قلم سے مسئلہ جہاد پر آج تک جو کچھ نکلا ہے وہ اسی ذلیل ڈپلومیسی کا نہایت شرمناک مظاہرہ ہے۔ یعنی جب انہوں نے ضروری خیال کیا کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اقوام دنیا کی حمایت حاصل کی جائے اور پھر دوسری اقوام کی امداد و اعانت سے مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو ختم کر دیا جائے تو انہوں نے اسلامی تعلیمات کا اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ شروع کیا اور اسلامی احکام و اعمال کو ایسی خوفناک اور سراپا غلط شکل میں پیش کیا کہ دیانت و صداقت سر پیٹ کر رہ گئی۔ اور اس ضمن میں مسئلۂ جہاد پر انہوں نے خاص طور پر زور دیا کیونکہ یہی وہ مسئلہ ہے جس سے دنیا کے انسانوں کو یہ باور کرایا جا سکتا تھا کہ مسلمان ایک سخت جنگجو، وحشی اور ظالم قوم ہے اور ان کے مذہب کی سب سے بڑی کتاب ہی ان کو اس وحشت و بہیمیت کا سبق دیتی ہے۔ اس لئے دنیا کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس قوم کا اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد میں ان کو بہت حد تک کامیابی ہوئی اور دنیا کی سب بڑی بڑی قوموں نے مل کر نہ صرف وحدت اسلامی کو پارہ پارہ کیا بلکہ اکثر ممالک اسلامی کو محکوم بنا لیا، مگر عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کو وحشی اور ظالم کہنے والوں نے وحشت و بربریت اور قتل و سفاکی کی ایسی مثال قائم کر دی کہ اسلامی تاریخ تو کیا پوری انسانی تاریخ میں اس کا جواب نہیں ملتا۔

الغرض جہاد اسلامی کی حقیقت نہ سمجھنے یا عمداً اس کو غلط لذادیں پیش کرنے کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ جہاد کے متعلق غیر اقوام تو کیا خود بہت سے مسلمان بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے دفاعی رنگ میں جہاد کو جس شکل میں پیش کیا وہ جہاد کی نہایت گمراہ کن تعبیر تھی۔ ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ جہاد کے داعیات اور مقاصد کیا ہیں۔ مگر سطور بالا سے اتنا سمجھا جا سکتا ہے کہ جہاد اسلامی اس مقدس سرفروشانہ جد و جہد کا نام ہے جو دنیا سے ظلم و تشدد اور انسانوں کے خود ساختہ معیار شرف کو مٹانے اور مظلوم انسانوں کی اس کثیر آبادی کو جسے انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا گیا ہے حقوق انسانیت سے بہرور کرنے، نیز انسانی حاکمیت کو ختم کرنے اور عالم انسانی میں ہمہ گیر امن و مساوات قائم کرنے کے لئے فرض کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ارباب سیادت و حکومت اور اہل دولت و ثروت کے لئے جہاد اسلامی یقیناً پیام ہلاکت ہے۔ مگر دنیا کے پس ماندہ اور غریب طبقوں کے لئے جہاد ہی وہ عمل عظیم ہے جو بلند و پست کے امتیاز کو مٹا کر انسانوں میں مساوات عامہ پیدا کرتا ہے۔ بلکہ دنیا کی عظیم ترین

آبادی کے لئے مجاہد کی صدائے تکبیر سے بڑھ کر کوئی آواز خوش آیند نہیں ہے۔

از صدائے سخن عشق ندیدم خوشتر یادگارے کہ دریں گنبد دوّار بماند

جہاد دراصل ایک نہایت معصوم اور مقدس انسانی عمل ہے جو داعیاتِ فساد کو جڑ سے اکھاڑنے اور انسانیت عامہ کی فلاح و نجات کے لئے معرض وجود میں آتا ہے اور اس کے سوا اس کا کوئی مقصد نہیں کہ خدا کی زمین میں خدا کا قانون مانا جائے، اور اس قانون کے تحت دنیا کے تمام انسان باہم بھائی بھائی بن کر رہیں اور دنیا کی وہ کثیر آبادی جو انسانی حاکمیت کے ماتحت حریتِ فکر اور مساواتِ عامہ کی برکات سے محروم ہے اسے خدائی نظامِ حیات کے ماتحت وہ سب کچھ حاصل ہو جو کسی بڑے سے بڑے حکمران یا امیر زادہ کو حاصل ہو سکتا ہے۔ عربی ہو یا عجمی، یورپ کا شہری ہو یا صحرائے افریقہ کا صحرائی، خدائی نظام میں اسے انسانیت کے وہ تمام حقوق حاصل ہوں جن کا وہ انسان کی حیثیت سے مستحق ہے۔ اور اس پر کسی گورے کی حکمرانی تسلیم کی جا سکے نہ کالے کی، بلکہ کوئی انسان دوسروں پر حکومت کرنے کا مجاز نہ ہو اور دنیا کے تمام انسان ایک ہی اعلیٰ و برتر ہستی کے محکوم ہوں اور مساویانہ طور پر خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھا سکیں یہ ہے حقیقتِ جہاد اور یہ ہے اس کا اصولی پس منظر! اب غور کیجئے کہ انسانوں کا وہ مقدس گروہ جو اس عظیم ترین مقصد کو لے کر اپنے عیش و آرام کو خیرباد کہتے ہوئے اس وادی پُرخار میں قدم رکھتا ہے کہ دنیا کی کثیر آبادی کو انسانی حاکمیت کے پنجۂ استبداد سے نکال کر احکم الحاکمین کے اقتدارِ اعلیٰ کے تحت لا کھڑا کرے اور دنیا کے تمام انسانوں پر فوز و سعادت کی راہیں کھول دے، کیا انسانی آبادی کا یہ فرض نہیں ہے کہ اس مقدس گروہ انسانی کے لئے اپنے دیدہ و دل کو فرشِ راہ بنالے؟ جو قدم دنیا کے مظلوم اور بیکس انسانوں کو حریت و آزادی دلانے کے لئے بڑھتا ہے، کیوں نہ اس کے آگے پھولوں کی سیج بچھا دی جائے؟ اور جو تلوار ان بدقسمت انسانوں کے حقوق کے لئے اٹھتی ہے جو ابدالآباد سے انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیئے گئے ہیں کیوں نہ ایسی تلوار کو متبسم ہونٹوں سے چوم لیا جائے، بلکہ ہر انسان کا اخلاقی اور انسانی فرض ہے کہ ایسی سرفروش اور محسنِ انسانیت جماعت کو سر آنکھوں پہ جگہ دے اور اس کے زندگی بخش پیغام کے ذریعہ مسرتِ جاودانی حاصل کرے۔ ؎

سرخوشی جاوداں خواہی بیا

ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا

حقیقت میں جہاد کی تعریف میں صرف وہی عمل داخل ہوگا جس کا مقصد استیصالِ فتنہ اور اعلاء کلمۃ الحق

ہو، یعنی خدا کی زمین میں صرف اسی کی حاکمیت اعلیٰ مانی جائے اور خدائی نظام کے ماتحت ہر انسان پر فوز و فلاح کی راہیں وا ہو جائیں۔ لہٰذا اس مقصد عظیم کے لئے جنگ کی جائے تو یہ جنگ شر نہیں بلکہ سراپا خیر ہے۔ جیسے ایک ڈاکٹر ناسور کا اپریشن کرتا ہے اور اس کے اس عمل کو کسی طرح قابل ملامت قرار نہیں دیا جاتا، کیونکہ وہ مریض کی جان بچانے کیلئے ایسا کرتا ہے اور اس کا یہ عمل اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ بالکل اسی طرح جہاد اسلامی انسانیت عامہ کو ضلالت و غوایت کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لئے عمل میں آتا ہے اور یہ مقدس عمل ہر لحاظ سے نہ صرف مستحسن بلکہ عالم انسانی کے لئے ناگزیر ہے۔ ہاں! اگر اس کی تہ میں کوئی اور مقصد کارفرما ہو تو وہ حقیقت میں جہاد ہی نہیں ہے بلکہ سراپا شر ہے۔

گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند — جنگ باشد قوم را نا ارجمند (اقبالؔ)

لفظ جہاد کا غلط استعمال

گذشتہ نصف صدی میں کانگریس کی سیاسی شنزی نے جہاد کے مقدس لفظ پر جو ظلم کیا ہے اس سے کون شخص واقف نہیں ہے۔ چنانچہ اس جماعت کے تمام مسلم اور غیر مسلم مراکز اشاعت نے اس لفظ کو نہایت بری طرح رسوا کیا اور ہر اس شخص کو مجاہد کا خطاب دیا گیا جو وطن اور قوم کے لئے ایک آدھ دفعہ جیل چلا گیا اور یہ کبھی نہیں سوچا گیا کہ مجاہد کا مقدس لفظ کس طرح کی معصوم سیرت، بلند کردار اور اعلیٰ اخلاق کی ترجمانی کرتا ہے اور جن لوگوں پر اس کا اطلاق کیا جا رہا ہے وہ مجاہد کے ضروری خصائص کے حامل ہیں یا نہیں۔ مگر حیرانی کی بات ہے کہ کانگریسی پراپیگنڈہ نے کچھ اس طرح جادو کا سا اثر کیا کہ ملک کے ہر حصہ میں یہ لفظ نہایت بے باکی کے ساتھ ہر کس و ناکس کے لئے استعمال ہونے لگا اور خود مسلمان بھی اس پراپیگنڈے سے بری طرح متاثر ہوئے۔ چنانچہ مجاہد وطن اور شہید وطن کے الفاظ صرف ہندوؤں کی زبان سے نہیں بلکہ مسلمان کی زبان سے بھی عام سنے جاتے رہے آج تک ان الفاظ نے ایک اصطلاحی حیثیت اختیار کر رکھی ہے اور اس وقت تک اس خطرناک غلطی کا ارتکاب ہوتا رہے گا جب تک عوام پر جہاد کی حقیقت منکشف نہ ہو جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ وطن، قوم یا نسل کے لئے جو جنگ لڑی جاتی ہے اس کی نوعیت زمانہ جاہلیت کی جنگوں سے کسی طرح مختلف نہیں ہے اور ان پر جہاد کا اطلاق صریحاً ظلم ہے، کیونکہ جس جنگ کو جہاد کے نام سے موسوم کیا گیا ہے وہ ایک مخصوص طرز کی جنگ ہے جس سے زمانہ حال

کسی وطنی اور نسلی جنگ کو کسی طرح کی مناسبت نہیں ہے۔ یعنی اسلام میں جو جنگ مشروع ہے وہ نہ صرف غرض وغایت کے اعتبار سے دوسری جنگوں سے مختلف ہے بلکہ اس کے ہجوم و دفاع کے طرز وطریق اور بین الملی آئین صلح وجنگ جدا ہیں اور ابتدا سے انتہا تک اسلام کی اخلاقی روح اس میں جاری وساری ہے۔ لہٰذا مجاہد کا لفظ، صرف اسی شخص کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے جس کی ایک ایک حرکت اسلام کے مابعد الطبیعیاتی تصورات اور اخلاقی اقدار (Moral Values.) کی پابند ہو یا وہ کم از کم اس کے لئے کوشاں ہو۔ نیز اس کے آداب صلح وجنگ بالکل وہی ہوں جو اسلام نے مقرر کر دیئے ہیں۔

داعیات جہاد اس سے قبل اجمالاً لکھا جاچکا ہے کہ اسلام جن مقاصد کیلئے جنگ وقتال کی اجازت دیتا ہے وہ کسی طرح انسانیتِ مطلقہ کے مفادات عام سے متصادم نہیں ہیں، بلکہ انسانیت کی حقیقی فلاح ان سے وابستہ ہے۔ نیز چونکہ یہ مقاصد ہمہ گیر حیثیت رکھتے ہیں اور ان کو کسی خاص انسانی گروہ سے کسی طرح کا اختصاص نہیں ہے اس بنا پر اسلامی جہاد میں کسی محدود اور معین وطنی اور نسلی قومیت کے سیاسی یا معاشی مفاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی نسلی یا قبیلوی عصبیت اس کے لئے محرک ہوسکتی ہے۔

مَن قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله (بخاری)

جو اس مقصد کے لئے لڑے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو تو اس کا یہ عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

یعنی اسلام کا جہاد ملی عہد حاضر کی قومی جنگ نہیں ہے کہ مسلمان محض ایک محدود نسلی یا جغرافی قوم (Nation) کی حیثیت سے کسی ایسی ہی دوسری قوم سے محض اس لئے برسرپیکار رہوں کہ اُکی نسل دوسری ہے یا اس کا وطن الگ ہے۔ بلکہ اسلام سرے سے کسی ایسی قومیت کو تسلیم ہی نہیں کرتا جس کی اساس ہمہ گیر الہیاتی تصورات کے بجائے کسی مادی نظریہ پر ہو، کیونکہ اس صورت میں جبکہ قومیتوں کی بنیاد جزوی منافع اور مادی اغراض پر ہو ہر قومیت دوسری قومیت سے من کل الوجوہ متضاد ہوگی اور ان کے مفادات ہمیشہ کیلئے باہم متصادم رہیں گے کیونکہ ان میں کوئی امر وجہ اشتراک نہیں ہوگا۔ مگر اسلام کے نزدیک کوئی مادی تصور بنائے قومیت نہیں ہے بلکہ چند اصول ونظریات ہیں جنکی بنا پر وہ ایک بین الملی قومیت (Internationlisim) کی تعمیر کرتا ہے اور اس صورت میں صرف دو قومیتوں کا وجود باقی رہ جاتا ہے۔ ایک اسلام کی بین الاقوامی قومیت ہے جس میں دنیا کا ہر انسان

کار نبوت اور عمل رسالت کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے صاف واضح ہو جائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی جدوجہد کا پہلا مرحلہ تطہیر فکر ہے اور پھر تعمیر فکر، یعنی تعمیر و اصلاح کی ابتدائی جدوجہد اسباب فساد کے ازالہ سے شروع ہوتی ہے اور تا وقتیکہ فساد کی نوعیت اور اس کے موجبات کا صحیح عرفان حاصل نہ ہو کوئی اصلاحی کوشش نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی، اگرچہ یہ کوشش ظاہر بین نگاہوں کے لئے کتنی ہی جاذب نظر اور پرکشش کیوں نہ ہو۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ حال کی ہر قومی تحریک کی ابتداء حقائق سے بالکل تہی دامن اور مفروضات کے مخمصوں میں الجھی ہوئی ہوتی ہے۔ یعنی اجتماعی اور ملی تحریک کو جس نقطۂ آغاز سے شروع کرنا چاہیئے اس کی طرف کسی کو خیال تک نہیں ہوتا، مگر محض بے حقیقت دعاوی اور بے معنی ہنگاموں سے تہلکہ بپا کر دیا جاتا ہے۔ یعنی فکر و عمل کی کج ادائیاں جوں کی توں باقی رہتی ہیں اور زور بیان کی سحر کاریوں سے اذہان و قلوب میں ہیجان پیدا کر دیا جاتا ہے۔

دوسرا داعیہ: تخریب فساد کی ناپاک کوشش

اصلاح انسانیت کی مقدس کوشش جسے قرآنی اصطلاح میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تعبیر کیا گیا ہے، مسلمان کی زندگی کا اولین فریضہ ہے اور اسی فریضہ کی صحیح بجا آوری کی بناء پر مسلمان کو امامت و قیادت کا عظیم الشان منصب عطا ہوا ہے۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آیہ)

تم سب سے بہتر امت ہو جسے لوگوں کی امامت کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ تم نیکی کا حکم
دو اور برائی سے روکو

اخرجت للناس کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ مسلمان کی زندگی کا ہر عمل عالم انسانی کی اصلاح و تعمیر کے لئے ہے اور اسی بناء پر اس کو خَيْرَ أُمَّةٍ کا جلیل القدر منصب دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس راہ میں جو کوشش بھی کی جائے خواہ وہ قلم و زبان سے ہو یا سیف و سناں سے، وہ جہاد کے وسیع معنوں میں داخل ہوگی اور اس غرض میں کسی طرح کی کوتاہی کی صورت میں سخت ترین عذاب کی دھمکی دی گئی ہے

إِنَّ اللهَ لَا يعذب العامة بعمل خاصة حتى يرو المنكر بين ظهر
انيهم وهم قادرون على ان ينكروه فلا ينكروه فاذا فعلو
ذالك عذاب الله

اللہ تعالیٰ چند افراد کی وجہ سے عامۃ الناس کو عذاب میں نہیں ڈالتا۔ تاوقتیکہ

وہ اپنے سامنے برائی کو دیکھیں اور وہ اس کے خلاف اظہار نفرت پر قادر ہوں مگر ایسا نہ کریں
اس صورت میں اللہ تعالیٰ چند بدکردار افراد کے ساتھ عامتہ الناس کو بھی مبتلائے عذاب
کرتا ہے۔

مگر چونکہ اس اہم فریضۂ زندگی کا تعلق عام انسانوں سے ہے اور عام انسانوں میں ایسے شر پسند اور فتنہ پرور لوگوں کی کمی نہیں ہوتی جو ہر ایسی اصلاحی تحریک کو کچلنے کا تہیہ کر لیتے ہیں اور فتنہ و فساد کی آگ کو ہوا دیتے ہیں۔ اس لئے اسلام نے ایسے لوگوں کے خلاف "تلوار اٹھانے کا مؤکد حکم دیا ہے" جو مسلمانوں کے اعلیٰ مقاصد کی راہ میں مزاحم ہوتے ہیں اور اپنی گوناگوں شر انگیزیوں سے ان کی اصلاحی کوششوں کو ناکام بنانا چاہتے ہیں

انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض
فسادًا ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف
او ینفوا من الارض ذالک لھم خزی فی الحیوۃ الدنیا ولھم
فی الاخرۃ عذاب عظیم (آیہ)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں
ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا سولی پر لٹکا دیا جائے یا ان کے ہاتھ
اور پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دیئے جائیں یا ان کو جلا وطن کر دیا جائے۔ یہ
ان کے لئے دنیوی زندگی میں ذلت کی سزا ہے اور آخرت میں ان کے لئے دردناک
عذاب ہے۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ
لا یحب المعتدین ○ واقتلوھم حیث ثقفتموھم واخرجوھم
من حیث اخرجوکم والفتنۃ اشد من القتل (آیہ)

تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو
کہ اللہ تعالیٰ ایسے تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور ان کو قتل کرو جہاں
تم ان کو پاؤ اور ان کو نکال دو اس جگہ سے جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے۔
اور فتنہ جنگ سے زیادہ خطرناک ہے۔

والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض

وفساد کبیر (انفال)

جو لوگ کافر ہیں وہ (اپنے اندرونی اختلافات کے باوجود) اسلام کے خلاف ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ اگر تم بھی ایسا نہ کروگے تو زمین میں فتنہ اور بھاری فساد پیدا ہو جائے گا۔

آیات مذکورہ میں اہل کفر سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے مگر مسلمانوں کی کوئی جماعت اگر وحدت اسلامی میں رخنہ پیدا کرنا چاہتی ہو تو اس کے خلاف بھی احادیث صحیحہ میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔

من جاءکم وامرکم جمیع یرید ان یفرق بینکم فاقتلوہ کائنا من کان (اخرجہ مسلم)

جو شخص اس مقصد سے تمہارے پاس آتا ہے کہ تمہارے شیرازۂ ملت کو منتشر کر دے تو اسے قتل کر دینا چاہیئے، خواہ وہ کوئی شخص ہو۔

تیسرا داعیہ حمایت مظلوم مظلوم انسانوں کی حمایت و امداد، انسان کا ایک اہم اخلاقی فرض ہے اور اسلام مسلمانوں کو نہایت سختی کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ وہ مظلوم کی امداد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ اس بارہ میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ بلکہ کسی انسان پر ظلم ہو رہا ہو تو مسلمان کا مذہبی فرض ہے کہ وہ اس کی امداد کو آگے بڑھے اور ظالم کو اس کے ظلم کی سزا دے۔

مالکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا واجعل لنا من لدنک ولیا واجعل لنا من لدنک نصیرا (النساء)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان کمزور مردوں، عورتوں، اور بچوں کے لئے نہیں لڑتے۔ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس بستی سے نکال دے جس کے باشندے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی حامی اور مددگار پیدا کر دے۔

عن ابی بکر انی سمعت رسول اللہ صلعم یقول ان الناس اذا رأو الظالم فلم یأخذ وا علی یدیہ اوشک ان یعمھم اللہ بعقاب منہ (اخرجہ الترمذی)

حضرت ابوبکرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کو ظلم سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں تو اللہ تعالےٰ ان سب کو عذاب میں مبتلا کردے گا۔

چوتھا داعیہ: نقض عہد یعنی اہل کفر کی کوئی جماعت مسلمانوں سے معاہدہ کرنے کے بعد عہد شکنی کا ارتکاب کرے۔ چونکہ یہ فعل ایک بدترین اخلاقی جرم ہے اور اسلام کسی ایسے جرم کی ایک لمحہ کیلئے بھی اجازت نہیں دیتا۔ اس بنا پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ ایسی قوم یا جماعت کو تلوار کے زور سے اطاعت پر مجبور کریں تاکہ وہ آئندہ ایسی حرکت شنیعہ کے ارتکاب کی جرأت نہ کرسکیں۔

الذین عاھدت منھم ثم ینقضون عھدھم فی کل مرۃ وھم لا یتقون فاما تثقفنھم فی الحرب فشرد بھم من خلفھم لعلھم یذکرون (توبہ)

جن کافروں سے آپ معاہدہ کرتے ہیں اور وہ ہر دفعہ معاہدہ کو توڑ دیتے ہیں اور وہ اس جرم عظیم سے بچتے نہیں ہیں، پس اگر آپ ان کو جنگ میں پالیں (تو ان کو ایسی عبرتناک سزا دیں) کہ ان کے ذریعہ آنے والی نسلوں کو منتشر کردیں تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

فقاتلوا آئمۃ الکفر انھم لا ایمان لھم لعلھم ینتھون (توبہ)

تم کفر کے رہنماؤں سے لڑو کہ ان کی کوئی قسمیں نہیں ہیں تاکہ وہ ایسی حرکتوں سے باز آجائیں۔

(باقی دارد)

(مغرب ص ۲۲ سے آگے)

اس کے ذمے اس دنیا اور اس سے بعد کی دنیا دونوں کے فرائض عائد ہو جاتے ہیں۔ یعنی اخلاقی بھی اور روحانی بھی۔ خدا کی مرضی کا معلوم کرنا اور اس کی تعمیل کرنا۔ اس طرح ایک عبد مسلم بیک وقت ایک راہب اور ایک سپاہی بن جاتا ہے۔ وہ نمازیں بھی پڑھتا ہے اور میدانِ جنگ میں جانے کیلئے بھی ہر وقت تیار رہتا ہے۔ لیکن صرف اس جنگ کیلئے جو دنیا سے کفر کے استیصال کیلئے ہو۔ (۱۶۳)

دنیا کی قومیں "کامیابی کا راز" ڈھونڈھنے میں ماری ماری پھر رہی ہیں۔ قرآن نے ایک مختصر سی آیت میں اس راز کو افشا کر کے رکھدیا ہے جس میں فرمایا۔

یاایھا الذین امنوا اصبروا (۱) — وصابروا (۲) - ورابطوا (۳) - واتقوا اللہ (۴) لعلکم تفلحون۔

اے مدعیانِ ایمان۔ (اگر کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو ساری باتوں کا ماحصل یہ ہے کہ)

(۱) خود بھی استقامت اختیار کرو۔
(۲) دوسروں کو بھی ثابت قدم رہنے کی تلقین کرو۔
(۳) ایک دوسرے کے ساتھ بندھ جاؤ۔ اور
(۴) اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔

تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

دنیا کی تمام قومیں، شق ۱ تا ۳ میں ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے میں مصروفِ جدوجہد ہیں۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے پر کامیابی اسی کو حاصل ہوگی جو ان خصائص میں فوقیت حاصل کرلیگی۔ لیکن انھیں اس سے اس زندگی کے حصول میں کبھی کامیابی نہیں ہو سکے گی جس کی تلاش میں وہ اس طرح سرگرداں اور پریشاں پھر رہی ہیں۔ اور نہیں سمجھ سکتیں کہ وہ کونسی شے ہے جس کی کمی سے

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی!

وہ ہے شقِ چہارم۔ اللہ کا تقویٰ۔ مسلمانوں کو اس وقت کسی شق میں بھی ایسا مقام حاصل نہیں جس سے وہ دنیا میں ابھرنے والی قوموں کے مدمقابل آسکیں۔ جہاں کچھ جہد للبقار کے آثار دکھائی دیتے ہیں وہ بھی پہلی تین شقوں تک محدود ہیں۔ وہ اقوام مغرب کے تتبع میں، زیادہ سے زیادہ استقامت (Endurance) اور باہمی ربط و ضبط (Unity and Discipline) کا درس دیتے اور سبق یاد کرتے نظر آرہے ہیں۔ شق چہارم (تقویٰ اللہ) کا مشرق و مغرب میں کہیں نشان نہیں ملتا۔

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری

پاکستان کا مسلمان بھی سردست اسی پیچ میں الجھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس وقت اسے استقامت اور باہمی اتحاد (بلکہ ائتلاف) کی ازبس ضرورت ہے اور اگر اس باب میں اسنے ذرا بھی

غفلت برتی تو ڈر ہے کہ خدا کی یہ نعمت کہیں اس سے چھن نہ جائے۔ لیکن حقیقی کامرانی وشادکامی کا راز اس استقامت و ارتباط باہمی کے ساتھ تقویٰ ہی ہے۔ ہم اپنی اہل انگاری کی وجہ سے اس وقت اپنے آپ کو اس خود فریبی میں مبتلا کئے ہوئے ہیں کہ جبتک یہاں قوانین شریعت کا نفاذ نہیں ہوتا ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ ہم نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر دھوکا دے رکھا ہے کہ جونہی یہاں شریعت کا نظام رائج ہوا ہم میں ازخود ایک تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے۔ یہ ہمارا فریبِ نفس ہے جو ہمیں آمادہ عمل نہیں ہونے دیتا اور اس ہلاکت انگیز تساہل و تغافل کو عدمِ تنفیذ قوانینِ شریعت کی آڑ میں چھپا کر مطمئن ہو جانا چاہتا ہے کہ ہم قصوروار نہیں ہوں۔ حالانکہ یہ سرتاسر فریب ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نظامِ شریعت پر صحیح معنوں میں عمل پیرا ہونے سے تسخیرِ فطرت اور تقویٰ حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ ہم اس وقت کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ تقویٰ ہر لمحۂ زندگی سے شروع کر دیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم آج اپنے معاملات میں خدا کو سامنے رکھ لیں تو اس تبدیلی کا نام تقویٰ ہوگا۔ اور جب اس تبدیلی پر جم کر کھڑے ہو جائیں تو اسے صبر کہا جائیگا۔ وہ صبر اور تقویٰ جسے قرآن نے من عزم الامور قرار دیا ہے (ان تصبروا وتتقوا فان ذالک من عزم الامور (۳/۱۸۶) اگر تم نے عمل میں استقامت اختیار کر لی اور دل میں تقویٰ تو بلاشبہ بڑے بڑے کاموں کی راہ میں یہ بڑے ہی عزم وہمت کی بات ہوگی)۔ قرآن نے اس باب میں نظامِ صلوٰۃ[1] کو بڑی اہمیت دی ہے۔ جسے آج بھی بلا تامل و توقف اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس کیلئے نہ کسی دستور ساز اسمبلی کی رسمی منظوری کی ضرورت ہے نہ اس کی ترویج کے لئے فوج اور پولیس کی احتیاج۔ اسی کے التزام و مداومت سے ہمارے قلوب میں وہ تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے جس سے نظامِ شریعت اپنے صحیح نتائج مرتب کر کے ہمیں امامت عالم کا مستحق و سزاوار بنادے گا۔ نظامِ صلوٰۃ کی حقیقی روح کیا ہے اور یہ کس طرح وہ انقلاب پیدا کر دیتا ہے جس سے عالم انفس و آفاق ایک نئی شکل اختیار کر لیتے ہیں تفصیل طلب امور ہیں جنہیں کسی دوسرے وقت پیش کیا جا سکے گا۔ سردست آپ اتنا تو کیجئے کہ اپنے تمام معاملات میں خدا کو سامنے رکھئے۔ اس ایک ننھے سے بیج سے وہ شجرِ طوبیٰ پیدا ہوگا جس کی جڑیں پاتال میں اور شاخیں سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچی ہوں گی۔ کزرع اخرج شطأہٗ اس کھیتی کی طرح جو پہلے اپنی سوئی نکالتی ہے۔ فآزرہٗ۔ پھر اسے مضبوط کرتی ہے۔ فاستغلظ پس وہ موٹی ہوتی جاتی ہے۔ فاستویٰ علیٰ سوقہ۔ پھر وہ اسی تنکے کے سہارے سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے حتیٰ کہ وہ لہلہاتا کھیت بن جاتی ہے۔ یعجب الزراع جس سے کسان کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں لیغیظ بھم الکفار۔ اور مخالفین جوشِ غیظ و غضب میں مارِ سیاہ کی طرح پیچ و تاب کھاتے ہیں۔ وعد اللہ الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات منھم مغفرۃ واجر عظیما (۴۸/۲۹) اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے، یہی وعدہ کر رکھا ہے ان کیلئے تمام آفات و مصائب سے حفاظت ہے اور اجرِ عظیم۔

---

[1] الصلوٰۃ کا نظام فی الحقیقت نظام حکومت خداوندی کا عکس اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن وہ صلوٰۃ نہیں جو آج محض رسمی طور پر پڑھ لی جاتی ہے۔ وہ صلوٰۃ جس نے محمد رسول اللہ والذین معہٗ کو اشداء علی الکفار رحماء بینھم کی خصوصیات کبریٰ سے نوازا تھا اور انہیں دنیا اور آخرت، ہر دو کی نعمتوں سے مالا مال فرما دیا تھا۔

نقد و نظر

اسلام کے مشہور سپہ سالار
حصہ اول و دوم

آج کے بچے کل کی قوم بننے والے ہیں۔ لہٰذا آپ کی قوم وہی کچھ ہوگی جو کچھ آپ کے بچے ہوں گے۔ مسلمان مجاہدین کی قوم تھی اور جب تک یہ پھر سے قوم مجاہدین نہیں بن جاتی اسے فلاح وکامیابی نصیب نہیں ہوسکتی۔ قوم مجاہد نہیں بن سکتی جب تک اس کے بچوں کے رگ و پے میں جہاد کی تعلیم سرایت نہ کر جائے۔ ہمیں افسوس اور رنج ہے کہ ہماری حکومت نے قوم کے بچوں کی تعلیم کو صحیح خطوط پر متشکل کرنے کے لئے ابھی تک کچھ نہیں کیا، لیکن یہ امر کسی قدر اطمینان بخش ہے کہ اس باب میں کہیں کہیں سے انفرادی کوششیں شروع ہوگئی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اسی قسم کی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ اس کے مصنف ہیں عبدالواحد صاحب سندھی، (مامی) جن کی پوری عمر بچوں کی فطرت کے مطالعہ اور ان کی تعلیم کے لئے نئے نئے طریقے سوچنے اور وضع کرنے میں گزری ہے۔ ان کا طریق تعلیم بچوں کے لئے مکتب کو قصاب خانہ کی بجائے تفریح گاہ بنا دیتا تھا اور وہ چھٹی کے دن بھی مدرسہ جانے کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ چنانچہ یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے اور عمدہ سلیقے سے لکھی گئی ہے۔ شروع میں مختصراً بتایا گیا ہے کہ اسلامی جہاد سے مفہوم کیا ہے۔ اور اس کے بعد مشہور سپہ سالاروں کے حالات ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ کی ابتدا خود نبی اکرمؐ سے ہی ہونی چاہیئے تھی۔ حصہ اول میں حضورؐ سے لیکر حضرت اسامہ بن زید کے حالات ہیں۔ اور حصہ دوم میں بنی امیہ سے شروع کرکے، خازم بن خزیمہ سپہ سالار عہد منصور تک کے حالات۔ اخیر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلامی جنگی بیڑا کیسے بنا۔ ہر حصہ قریب اڑھائی سو صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت فی حصہ اڑھائی روپے ہے۔ کتاب سرسید عاشنگ ہاؤس، کراچی، سے مل سکتی ہے۔ اسے اپنے بچوں کو ضرور پڑھائیے بلکہ خود بھی پڑھئے۔

حقائق و عبر

۱- مودودی صاحب کا فتوے

پچھلے دنوں مودودی صاحب نے جو فتوے صادر فرمایا کہ کشمیر کی لڑائی جنگ ہے جہاد نہیں ہے اور مسلمانانِ پاکستان کو اس میں شرکت نہیں کرنی چاہیئے۔ تو اس کے متعلق ہمیں بھی بہت سے استفسارات موصول ہوئے۔ لیکن مودودی صاحب کا "فتویٰ" کچھ ایسا طفلانہ سا تھا، کہ علم اور حقیقت کے اعتبار سے اس پر گفتگو ہی لاحاصل تھی۔ البتہ بعض حضرات نے ہم سے پوچھا ہے کہ بالآخر مودودی صاحب کا اس سے مقصد کیا تھا! ہم اس باب میں اتنا عرض کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ جہاد کے خلاف اس قسم کے فتاویٰ کوئی نئی چیز نہیں۔ جب اور جہاں کہیں مسلمانوں کے اندر کسی حرکت کے آثار پیدا ہوئے اور ان سے دشمنانِ اسلام کو خطرات لاحق ہوئے تو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ انگیزی کے لئے اس قسم کے فتاویٰ منصۂ شہود پر آگئے۔ حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کی تحریک جہاد کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ

ترکش مارا خدنگ آخرین

جب وہ تحریک ترقیوں کے زینے چڑھتی جا رہی تھی اور کیفیت یہ تھی کہ سرحد سے سکھوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ مسلمانوں کا پرچم فضائی پہنائیوں میں لہرا رہا تھا۔ اور انگریز اور سکھ دونوں اس کی اس رفتار سے بدحواس ہو رہے تھے۔ تو اس وقت یہی تیر تھا جس نے مجاہدین کے سینوں کو وساوس انگیزی سے چھلنی کر دیا۔ اس کیفیت کو مصنف "سیرت سید احمد شہید" کی زبان سے سنئے۔ آپ لکھتے ہیں۔

> **ایک فتنہ** | دہلی کے ایک مشہور عالم نے جن کے مزاج میں تیزی تھی، اور میدان جنگ کی سختیوں کے عادی نہ تھے، راستہ میں دریاؤں کو جو سدِّ راہ تھے تنگ آکر سید صاحبؒ کو خط لکھنے شروع کئے، کہ پہلے ان کلمہ گو کافروں سے جہاد کرو، میدان جہاد میں پہونچ کر بھی اُن کی برافروختگی نہ گئی، اپنا خیمہ مجاہدین سے الگ ڈالا اور بعید

صاحبؒ پر ادھر اعتراضات شروع کئے، مثلاً آپ کا باورچی خانہ کیوں الگ ہے؟ سید صاحب نے فرمایا یہ مہمانوں کے واسطے ہے جو روزانہ آتے جاتے رہتے ہیں اور اس میں صرف وہی چیزیں پکتی ہیں جو مخصوص ہدیہ اور ذاتی ملکیت ہوتی ہیں، بیت المال سے اس میں کچھ صرف نہیں ہوتا، مولوی صاحبؒ نے کہا کہ وہ سب تحائف بھی مجاہدین پر برابر تقسیم ہونے چاہئیں، سید صاحب نے فرمایا بہتر ہے یہ کام میں آپکے سپرد کرتا ہوں، آپ یہ خدمت اپنے ذمہ لیجئے، اس پر وہ لاجواب ہوگئے، انہوں نے آپکی امامت میں قدح کرنا شروع کیا، سید صاحب نے فرمایا کہ آپ کے نزدیک میں اس کے لائق نہیں ہوں، تو خدا کے فضل سے آپ سید بھی ہیں، عالم، مہاجر اور جامع صفات ہیں، اس بارِ گراں کو آپ قبول کریں، میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں، آج سے آپ امام اور میں آپ کا تابعدار ہوں، مقصود کام کرنا ہے، سرداری نہیں، اس پر وہ خاموش ہوگئے، مگر انہوں نے اہل لشکر سے کہنا شروع کیا کہ تمہارے اوپر بیوی بچوں اور والدین کے حقوق ہیں، تم یہاں کیوں بیٹھے ہو، لوگوں نے کہا جہاد کے واسطے، مولوی صاحب نے فرمایا جہاد کہاں ہے اور کون سے کفار سے مقابلہ ہے، کس میں تمہارا عمل دخل ہوا، صبح سے شام تک تم لوگ کھانے پکانے کی فکر میں رہتے ہو، جہاد کا محض بہانہ ہے، تمہاری دنیا و آخرت دونوں خراب ہیں، لوگوں کو ایک معتبر عالم کی زبان سے یہ سن کر خواہ مخواہ انتشار ہوا اور لشکر میں اس کا عام چرچا اور فتنہ کا اندیشہ ہوا، جس سے کام کو نقصان پہونچنے کا خطرہ تھا، اتفاق سے مولانا اسمٰعیل صاحب شہیدؒ اس وقت موجود تھے اور سریہ میں گئے ہوئے تھے ورنہ اس کا بہت جلد فیصلہ ہو جاتا۔ آخر محمد حسن صاحب رامپوری نے سید صاحبؒ سے کچھ کہنے کی اجازت چاہی اور نماز کے بعد سب لوگ موجود تھے، مولوی صاحب سے کہا کہ آپ یہاں کے لوگوں کو کس طرح خارج از جہاد سمجھتے ہیں، مولوی صاحب نے کہا کہ تم کس سے جہاد کر رہے ہو اور کون سا جہاد ہو رہا ہے،

> محمد حسن صاحب نے کہا کہ جنگ کا نام ہی جہاد نہیں، جنگ کو قتال کہتے ہیں اور وہ کبھی کبھی پیش آتا ہے، جہاد کے معنی ہیں: لاعلائے کلمۃ اللہ میں کوشش کرنا، یہ مدت دراز تک باقی رہتا ہے اور اسکی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، یہ آپ کی غلط فہمی ہے کہ قتال کا نام جہاد رکھا ہے اور ان کوششوں کو جو اعلائے کلمۃ اللہ کے واسطے لوگ کر رہے ہیں عبث قرار دیتے ہیں، میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اس وقت جہاد کا انکار کرکے آپ وطن دہلی تشریف لیجائیں اور کسی دن کفار سے مقابلہ اور قتال جس کو آپ جہاد کہتے ہیں پیش آجائے تو کس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر آپ کو اس کی اطلاع دی جائے گی اور آپ اپنی کون سی کرامت سے اڑ کر داخل جہاد ہونگے

انکا فتنہ یہ اکتفا نہیں ہوا بلکہ سرحد کے بعض "علماء" بھی میدان میں آئے اور انہوں نے طرح طرح کے الزامات اس تحریک اور بانیٔ تحریک کے خلاف تراشنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ، مصنف موصوف کے الفاظ ہیں

> سرحد کے علماء نے مشہور کیا کہ یہ ہندوستانی علماء اور ان کا امیر لامذہب لوگ ہیں۔ خواہش نفسانی کے پیرو اور آزاد خیال ہیں.... مجاہدین کے ساتھ جنگ کرنے میں جو بعض سردار اور باغی قتل ہوئے تھے ان کا قتل اور ان کے علاقوں پر قبضہ بھی مجاہدین کے خلاف سخت الزام تھا۔ علماء کہتے تھے کہ یہ لوگ مسلمان کے جان و مال کو کوئی چیز نہیں سمجھتے اور بلاوجہ شرعی مسلمانوں کی جان و مال پر دست درازی کرتے ہیں۔ بعض لوگ اس سے آگے بڑھ کر مجاہدین کو باغی اور باغی مقتولین کو شہید کہتے تھے۔

چنانچہ حضرات علماء کرام "کی اس" مجاہدانہ تگ و تاز" کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں اسی طرح بددلی پھیل گئی جس طرح مودودی صاحب کے فتوٰی سے مجاہدین کشمیر میں سے بعض سادہ لوح لوگ متاثر ہو گئے۔ اور اس طرح وہ تحریک، جو ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی ضامن بننے والی تھی ان "مقدسین" کے فسادِ دلی کی نذر ہو کر رہ گئی۔

اس تحریک کے بقیۃ السیف مجاہدین کے سینوں میں ایمان کی جو حرارتیں موجود تھیں، وہ انگریزی حکومت کے لئے بڑی خطرناک سمجھی جاتی تھیں۔ ان چنگاریوں کو دبانے کے لئے "پیر" مذہب" ہی

کو آگے بڑھایا گیا اور قادیان کے "باب نبوت" سے یہ فتویٰ صادر ہو گیا کہ

اسے دوست جہاد کا اب چھوڑ دو خیال

کشمیر کا مسئلہ پاکستان کے لئے موت اور حیات کا مسئلہ ہے۔ چونکہ مودودی صاحب شروع سے پاکستان کے خلاف چلے آ رہے ہیں اس لئے وہ کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ کشمیر پاکستانی مسلمانوں کے لئے وجہ تقویت بن جائے۔ اس لئے ان کے فتویٰ کا مفہوم ظاہر ہے۔ غیر مسلم عناصر پاکستان کی تخریب میں ایک متحدہ محاذ بنائے جا رہے ہیں اور "مقدسین" کا یہ طائفہ پاکستان کے اندر بیٹھا، اس قسم کے فتنے پھیلا رہا ہے۔

دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد — دینِ ملا فی سبیل اللہ فساد
شبنم ما در نگاہِ ما یم است — از نگاہِ او یم ما شبنم است

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبی — آسمانش تیرہ از بے کوکبی
از شکر خنہائے آں قرآں فروش — دیدہ ام روح الامیں را در خروش

ہوس فتویٰ بازی کی تو ان کی یہ کیفیت۔ لیکن کیریکٹر کا یہ عالم کہ اس فتویٰ کے خلاف ذرا سی تحریک ہوئی اور یہ لگے بغلیں جھانکنے۔ کہیں اس فتویٰ کی تاویلیں ہو رہی ہیں۔ کہیں توجیہات بیان کی جا رہی ہیں۔ پھر اس سے رجعت اختیار کر لی جاتی ہے اور "پاکستان کے فدائی" بلکہ خود اس "جہاد" میں شرکت کے ارادے ظاہر کئے جاتے ہیں۔

در کفرہم پختہ نہ ای — زنار را رسوا مکن

اور پھر اپنی علمی بصیرت پر اعتقاد کی یہ کیفیت کہ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کو لکھتے ہیں کہ اگرچہ میں آپ کے دلائل سے مطمئن نہیں ہوا لیکن اگر آپ یہ لکھدیں کہ آپ اپنی کامل بصیرت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کشمیر کی جنگ جہاد ہے تو میں اپنے خیالات سے رجوع کر لوں گا۔ لیکن جب علامہ صاحب لکھ دیتے ہیں کہ میں اپنی کامل بصیرت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں تو پھر مودودی صاحب غرہ کر جاتے ہیں اور کوئی جواب ہی نہیں دیتے

یہ ہے اس شخص کی حالت جس کا قادیانی نبوت کی تقلید میں دعوےٰ یہ ہے کہ

آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے

اور جس کے حواریوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ شخص چالیس کروڑ مسلمانوں میں اپنے آپکو تنہا پاتا ہے[1]

حیرت ہے کہ پنجاب کی سرزمین اس قسم کے لوگوں کو کس قدر راس آتی ہے! اور ابھی تو ابتدا ہے۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

---

[1] جس زمانہ میں سید محمد شاہ صاحب مدیر "پیغام حق" مودودی صاحب کی رفاقت میں اسلام کیا کرتے تھے تو انہوں نے اپنے رسالہ میں ایسا کچھ لکھا تھا۔ معلوم نہیں سید صاحب کا اب مودودی صاحب کے متعلق کیا خیال ہے؟

۲۔ مارہائے آستین

پاکستان کو یکسالہ مدتِ قیام میں جن جن خطرات کا سامنا کرنا پڑا ہے ان میں سے عظیم ترین خطرہ اُن انتشار پسند اور تخریبی عناصر کا ہے جو اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔ طلوعِ اسلام شروع سے ہی پاکستان کے اربابِ اختیار کی توجہ اس عظیم ترین خطرہ کے استیصال کی طرف مبذول کرا رہا ہے۔ حکومت کے ذمہ دار ارکان خود اُ قوم کو ایک سے زیادہ مرتبہ ان عناصر کی حرکاتِ شنیعہ سے خبردار کر چکے ہیں جو حکومتِ وقت کے خلاف عام بدظنی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اندرونی خلفشار پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان میں ضم کرنے کی راہ ہموار ہو سکے۔ یہ عناصر جنہیں اربابِ حکومت رکنِ پنجم (ففتھ کالم) کا نام دیتے ہیں، کوئی ایسی باضابطہ تنظیم نہیں جس کے امتیازی نشانات سے ہم اسے پہچان سکیں۔ یہ لوگ ہمارے معاشرے کے ہر شعبہ میں موجود ہیں۔ تجارت میں، صحافت میں، ملازمتوں میں اور پاکستان کے کلیدی مقامات پر ہر جگہ یہ سرگرمِ عمل ہیں۔ یہ لوگ پاکستان کے شدید ترین مخالف رہے لیکن قیامِ پاکستان کے ساتھ یہ "پاکستان یا ہندوستان" کے حق انتخاب کا استعمال کرتے ہوئے ملازمین کی صورت میں یا مہاجرین کی معصوم شکل میں پاکستان پہنچے۔ احوال و ظروف کی تبدیلی کے ساتھ ان کے دوائرِ عمل اور وسائلِ شر انگیزی ضرور بدلے لیکن یہ حقیقت حقیقت ہی رہی کہ ان کے قلوب کارگہِ شیطان ہیں۔ یہ ناممکن تھا کہ محض ایک آئینی تبدیلی سے، جو اس قدر برق رفتاری سے مکمل ہو گئی تھی، ان کے دلوں میں یک لخت پاکستان کے ساتھ محبت پیدا ہو جاتی۔

ہم نے بارہا عمائدینِ حکومت سے لوزائیدہ مملکتِ پاکستان کے تحفظ و بقاء کا واسطہ دے کر گذارش کی کہ وہ دشمن کے ایجنٹوں اور رکنِ پنجم کے ان عناصر کے محض ضمنی تذکروں پر ہی اکتفا نہ کریں بلکہ انہیں آشکارا کر کے ان کی بداندیشیوں اور شورش انگیزیوں کو ختم کرنے کیلئے سخت اور مؤثر اقدامات کریں تاکہ ملت ان کے ناموں کے علاوہ ان کا انجام بھی دیکھ سکے۔ حکومت کی غفلت سے اُن کی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے ذمہ دار اشخاص اور اخبارات نے ان تخریبی کارروائیوں کے متعلق جن جذبات کا اظہار کیا اُن سے یہ حقیقت ایک بار پھر نکھر کر سامنے آ گئی کہ پاکستان میں آزادیٔ تحریر و تقریر کے جمہوری حق کا ناجائز استعمال کرنے والوں کو کس کی چشم و ابرو کا اشارہ مل رہا ہے۔

پچھلے دنوں صوبہ سرحد میں رسوائے عالم خان برادران اور ان کے چند ایک رفقائے کار کے خلاف صوبائی حکومت نے ایک تاخیری اقدام کیا اور حال ہی میں سُرخ پوش جماعت کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ سُرخ پوش جماعت کا نامۂ اعمال مخالفتِ پاکستان سے اس قدر سیاہ ہو چکا تھا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد اسے ایک لمحہ کے لئے بھی باقی نہیں رہنا چاہئے تھا لیکن حکومت نے پورے ایک سال تک اسے ڈھیل دئے رکھی۔ آخر جب ان سیاہ رُو سرخ پوشوں کی سرگرمیوں سے مملکتِ پاکستان کے وجود کو براہِ راست

خطرہ پیدا ہونے لگا تو ان کے خلاف وہ کم سے کم کارروائی کی گئی جو ایک مملکت اپنے تحفظ کیلئے کر سکتی ہے حکومت کے اس اقدام کے خلاف خود پاکستان کے بعض حلقوں سے احتجاج کیا گیا لیکن اس سے کہیں زیادہ قابلِ توجہ وہ ردِ عمل ہے جو ہندوستان میں ہوا ہے۔ پچھلے دنوں ہندوستان کی پارلیمنٹ میں ایک رکن نے سوال کیا کہ بین المملکتی تبدیلی لمکہ تبادلہ کے سلسلہ میں خان برادران کو بھی ہندوستان منتقل کرنے کا انتظام کیا گیا ہے یا نہیں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے وزیر بے محکمہ مسٹر آئنگر نے بتایا کہ حکومت کے زیرِ غور کوئی ایسی تجویز نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ خان برادران اس قدر "محبانِ وطن" ہیں کہ اگر انہیں ہندوستان منتقل ہو جانے کو کہا جائے تو ممکن ہے کہ وہ اسے اپنی توہین سمجھیں۔ تکلفات کا حجاب اٹھاتے ہوئے مسٹر آئینگر نے آگے چل کر بات کھل کر کر دی کہ پاکستان کو اس کے "اعمالِ بد" سے باز رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ خان برادران وہیں رہیں۔

خان برادران اور ان کے حواریوں کے غم میں نڈھال ہونے والے پاکستانیوں کے لئے ہندوستان کا یہ سرکاری بیان سرمۂ چشمِ بصیرت ہونا چاہئے تھا۔ اس سرٹیفکیٹ کے بعد ان لوگوں کی معصومیت کا ڈھنڈورہ پیٹنے اور انہیں مملکتِ پاکستان کا وفادار ثابت کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں کو ہندوستان میں اس حد تک بانس پر چڑھایا جا رہا ہے وہ پاکستان کے کتنے بہی خواہ یا وفادار ہو سکتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستان کی ہر حرکت اس مقصد کو پورا کرنے کی خاطر ہوتی ہے کہ پاکستان کو ختم کر دیا جائے یا اس کی راہ میں گوناگوں مشکلات پیدا کی جائیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان' ایسے لوگوں کو محبِ وطن نہیں کہہ سکتا جو پاکستان کی ہستی برقرار رکھنے کی دیانتدارانہ آرزو رکھتے ہوں۔ غدارانِ پاکستان کی سیاہ کاری اگر اب تک پوری طرح آشکارا نہیں ہوئی تھی تو یہ فرض ہندوستانی حکومت کے سرکاری نقیب ہندوستان ٹائمز نے بطریقِ احسن سرانجام دے دیا ہے۔ سرخ پوش جماعت کو خلافِ قانون قرار دینے کے متعلق ایک تند و تیز اداریہ میں ہندوستان ٹائمز لکھتا ہے۔

> حکومت سرحد کا یہ اقدام ہندوستان کے لئے ایک اور لحاظ سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت پاکستان ان تمام لوگوں کو کچلنے پر تلی ہوئی ہے جو ہندوستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ نفرت پھیلا کر برسرِ اقتدار آئے ہیں وہ قدرتی طور پر محسوس کرتے ہیں کہ محض مزید نفرت پیدا کرنے سے ہی وہ اپنی پوزیشن کو مستحکم اور اپنے آپ کو برسرِ اقتدار رکھ سکتے ہیں۔ لیکن پاکستان صرف اسی صورت میں پھل پھول سکتا ہے کہ وہ ہندوستان کے ساتھ معقول

> دوستانہ روابط رکھے ۔ ورنہ نہیں ۔ یہ ایک ایسا سبق ہے
> جو قائدینِ لیگ نے ابھی تک نہیں سیکھا۔
>
> (ہندوستان ٹائمز ۹/۱۸/۴۸)

دیکھا آپ نے! ہمدردی کے کتنے بے تابانہ جذبات ہیں جو ان "محبانِ وطن" کے لئے امڈے چلے آ رہے ہیں "جو ہندوستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتے ہیں۔" کیا اب بھی کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ خان برادران اور ان کے سرخ پوش پاکستان کے وفادار ہیں؟

اس سلسلہ میں ہندوستان کے ہندوؤں کے جذبات سے زیادہ دلچسپ وہ بیان ہے جو حسین احمد صاحب مدنی صدر جمعیت العلمائے ہند نے دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

> صوبہ سرحد میں خدائی خدمتگاروں پر نت نئے مظالم کی جو اطلاعات ہم تک پہنچ رہی ہیں اگر وہ صحیح ہیں تو قیوم وزارت کا طرزِ عمل بہت قابلِ افسوس اور مذموم ہے۔ سرخ پوش "قوم[1] کے سچے خادم ہیں اور انہوں نے جنگِ آزادی میں ہمیشہ نمایاں حصہ لیا ہے۔ میں حکومت سرحد کو متنبہ کرتا ہوں کہ اسلام کے جعلی نام پر ان فسطائی اطوار کو قوم برداشت نہیں کرے گی
>
> (ہندوستان ٹائمز ۹/۷/۴۸)

مدنی صاحب یہ باتیں وہ سب کچھ جاننے کے باوجود کر رہے ہیں جو ہندوستان کی سیاسی جماعتوں اور خود ان کی اپنی جماعت سے ہوا۔ ہندوستان ٹائمز نے پاکستان کو تنبیہ کرتے ہوئے اپنے محولہ فوق اداریہ میں یہ تو لکھ دیا ہے کہ "ایک جمہوری نظامِ حکومت میں آئینی حزبِ اختلاف کا وجود لازمی ہے" لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت باقی رہتی ہے کہ ہندوستان میں آئینی حزبِ اختلاف کا وجود ہی نہیں بلکہ تصور تک بھی ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ کانگرس کی فسطائی جماعت کی موجودگی میں کسی دوسری سیاسی جماعت کو میدانِ سیاست میں آنے کی اجازت نہیں۔ حد یہ ہے کہ ہندوؤں کی باا‌ثر سیاسی جماعت، مہاسبھا، سے بھی یہ آئینی حق چھین لیا گیا ہے کہ وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکے حسین احمد صاحب اور ان کے ہم خیال علماء غیر تقسیم شدہ ہندوستان میں مسلم سیاست کی اجارہ داری کے دعویدار رہے انہوں نے اسی حیثیت سے کانگرس کا ساتھ پوری وفاداری سے دیا۔ لیکن فسطائی سیل کے آگے وہ بھی ٹھہر نہ سکے۔ مولانا "ابوالکلام آزاد کے حکم پر انہوں نے اپنی جمعیت العلماء کو اپنے ہاتھوں ختم کر دیا اور

---

[1] قارئین طلوع اسلام "قوم" کے ان معنوں کو ذہن میں رکھیں جو مدنی صاحب کا مقصود ہے۔

یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ جمعیت کو سیاسیات سے کوئی سروکار نہیں رہیگا کیونکہ اسکا اجارہ اب کانگریس کو دیا جا چکا ہے

اس خودکشی (Scuttling) کے بعد حسین احمد صاحب کو یہ زیب نہیں دیتا۔ کہ وہ پاکستان کی ان سیاسی جماعتوں پر پابندی پر اعتراض کریں جن کا وجود ہی مخالفتِ پاکستان کے جذبہ کا مرہون منت ہے۔ انہیں اپنی جان، اپنے مال اور اپنی آبرو کے تحفظ کے لئے پاکستان کے سوا کوئی پناہ گاہ میسر نہ آسکی لیکن پاکستان کے اس احسانِ عظیم کے باوجود وہ اس دارالامان کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ بہتر ہے کہ پاکستان کو اپنے مشوروں سے نوازنے کی بجائے وہ اپنے گھر کی خبر لیں۔ پاکستان اپنے داخلی امور کو خود بہتر سوچ سکتا ہے

۳۔ ہفتہ وار "استقلال" لاہور

اگست کے طلوعِ اسلام میں ہم نے "مورخِ ثانی" کے عنوان سے حکومتِ مغربی پنجاب کے سرکاری ترجمان "ہفتہ وار" استقلال" کے متعلق چند گذارشات پیش کرتے ہوئے بتایا تھا کہ حکومت کے خزانہ کا کس قدر بے دردانہ ضیاع کیا جا رہا ہے۔ نیا ادارہ لاہور کے شائع کردہ مجلہ "سویرا" نے اس سلسلہ میں چند دلچسپ اعداد و شمار مہیا کئے ہیں جنہیں قارئین طلوعِ اسلام کی دلچسپی کے لئے درج ذیل کیا جاتا ہے تاکہ انہیں اندازہ ہو سکے کہ جس صوبے کا معاشی نظام تقسیم اور آبادی کے وسیع تبادلہ سے کلی طور پر درہم برہم ہو چکا ہے اور جسے لاکھوں خانماں برباد مہاجرین کی بحالی کا اہم اور کٹھن کام درپیش ہے، وہاں 'عوامی' حکومت کی غلط بخشیاں کیا گل کھلا رہی ہیں۔

سرکاری خزانہ سے اس اخبار کے خرچ کے لئے جو رقم منظور ہوئی ہے اسکی تفاصیل یہ ہیں:-

ایک ایڈیٹر	تنخواہ ۴۲۵ روپیہ	مع الاؤنس		
دو سب ایڈیٹر (۲۶۰ روپیہ فی کس)	" ۵۲۰	"	"	"
ایک منیجر	" ۲۲۰	"	"	"
ایک پروف ریڈر	" ۱۳۵	"	"	"
ایک اکاؤنٹنٹ	" ۱۲۰	"	"	"
ایک جونیئر کلرک	" ۸۰	"	"	"
ایک مُحرر	" ۷۵	"	"	"
ایک ریسٹورر	" ۶۵	"	"	"
ایک دفتری	" ۴۵	"	"	"
۴ چپڑاسی (۴۰ روپے فی کس)	" ۱۶۰	"	"	"

اس کے علاوہ امدادی اسٹاف بھی رکھا گیا ہے جو براہِ راست "استقلال" کے ادارہ میں شامل نہیں لیکن اس کا کام "استقلال" کیلئے لکھنا اور مواد فراہم کرنا ہے۔

ایک ریسرچ افسر		۴۶۵ روپے
دو کیمرہ مین	(۳۰۰ روپیہ فی کس)	۶۰۰ روپے
ایک آرٹسٹ		۴۲۵ روپے

اس اخبار کی اشاعت کا غذ اور چھپائی کے لئے ۵۰ ہزار روپیہ کی رقم الگ منظور کی گئی ہے جسے ملا کر سال بھر کا خرچ ایک لاکھ ۴۳ ہزار ۴۰۵ روپے بنتا ہے۔

اگر پورے محکمہ تعلقات عامہ کے اخراجات کا جائزہ لیا جائے تو کل رقم نو لاکھ روپیہ سے اوپر جا پہنچتی ہے۔

۳۶ صفحے کا یہ اخبار جو آف سیٹ پر چھپتا ہے اور جس میں متعدد دو رنگی اور سہ رنگی تصاویر بھی ہوتی ہیں، ایجنٹوں کو پونے گیارہ پیسے میں دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس پر کسی صورت میں بھی ایک روپیہ فی کاپی سے کم لاگت نہیں آتی۔

طلوع اسلام حکومت مغربی پنجاب کے اس اقدام پر پہلے ہی تبصرہ کر چکا ہے۔

طلوع اسلام کا اعتراض یہ نہیں کہ اس قدر روپیہ کیوں صرف کیا جا رہا ہے۔ بلکہ حقیقی اعتراض یہ ہے کہ آخر اس خرچ سے فائدہ کیا حاصل ہوتا ہے؟ کیا قومی خزانے کا یہ حصہ محض اس لئے بیدریغ خرچ کیا جا رہا ہے کہ اس کے ڈرامے، اس کے افسانے، فلاں کی نظمیں مہیا کر کے شائع کی جائیں۔ طلوع اسلام کے نزدیک یہ اسراف ہی نہیں تبذیر ہے۔ حکومت کو ہر مفید اقدام کے لئے پیسہ خرچ کرنا پڑیگا لیکن ہر خرچ کا جواز وہ نتائج ہوں گے جو اس سے مترتب ہوں گے۔ ہم جملہ صوبائی حکومتوں سے بھی اور مرکزی حکومت سے بھی یہی گزارش کرتے ہیں کہ وہ یا تو ان رسائل اور جرائد کو جو حکومت کی طرف سے نت نئے دن نکلتے چلے آ رہے ہیں اس ڈھب پر لائیں کہ وہ ملت کی تعمیر میں کوئی مفید کام کر سکیں ورنہ اس صرفِ بیجا کو ختم کریں۔ ہماری نوزائیدہ مملکت اس قسم کی "ذہنی عیاشیوں" کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

جولائی ۱۹۴۷ء میں ہالینڈ کی استعماری حکومت نے انڈونیشیا کے خلاف جنگ کی طرح ڈالتے ہوئے دنیا کی آنکھوں میں یوں دھول جھونکنے کی کوشش کی تھی کہ اس کا اقدام جنگ یا اعلان جنگ نہیں ہے بلکہ محض تادیبی، پولیس، کارروائی ہے۔ حقیقت حال سب پر الم نشرح تھی۔ چنانچہ ہر چند انڈونیشیا اقوام متحدہ کا رکن نہیں تھا یہ معاملہ اس بین الاقوامی ادارہ کے روبرو پیش ہو گیا۔ شائد قارئین کو اب یاد دلانے پر بھی یقین نہ آئے کہ اس قضیہ کو اقوام متحدہ میں پیش کرنے والے آسٹریلیا اور ہندوستان تھے۔ ہندوستان نے پہلے تو برطانیہ اور امریکہ سے اپیل کی کہ وہ اس معاملہ کو کسی ثالث کے سپرد کرائیں اور پھر آسٹریلیا سے مل کر معاملہ کو اقوام متحدہ کے سپرد کر دیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہندوستان پوری طرح آزاد نہیں تھا۔ کسے خبر تھی کہ مظلوموں کی حمایت کا داعی نیم آزاد ہندوستان آزاد ہو کر خود ظالم اور استعمار پسند ہو جائیگا۔ بمشکل ایک سال گزرنے پایا تھا کہ خود ہندوستان کو حیدر آباد میں پولیسی کارروائی کی ضرورت محسوس ہو گئی!

ہندوستانی فوجیں ۱۳ ستمبر کو حیدر آباد کی حدود میں حیدر آباد کی مفروضہ بد امنی کو دور کرنے اور "امن" بحال کرنے کیلئے داخل ہو گئیں۔ ہندوستان جیسی "عظیم" قوت کا حیدر آباد جیسی "صغیر" دولت پر حملہ ہالینڈ کے تتبع میں یا ہٹلر کے چیکوسلواکیہ، پولینڈ وغیرہ پر حملوں کی یاد تازہ کرنے کیلئے ہی نہیں تھا بلکہ ۱۳ تاریخ بھی قصداً منتخب کی گئی تھی۔ ۱۸۲۷ء کی اسی تاریخ کو بالاجی باجی راؤ مرہٹہ پیشوا نے نظام پر حملہ کیا تھا۔ نہرو کی غیر مذہبی (Secular) حکومت نے اس "تاریخی" "حملا اور" قومی یوم کی سالگرہ منائی اور یہ تیوہار حیدر آباد میں جا کر اس لئے منایا گیا کہ وہاں کے ہندو مسلمان، عیسائی وغیرہ باشندوں[1] پر طرح طرح کے مظالم ہو رہے تھے اور ریاست میں فوضویت (Anarchy) برپا تھی۔

---

[1] سقوط حیدر آباد سے یہ مقصد بہت حد تک پورا ہو گیا ہے۔ بہت حد تک اسلئے کہ اب مظالم کا تختۂ مشق صرف مسلمان رہ گئے ہیں۔ دہلی کی جامع مسجد میں اس کامیابی پر یوم تشکر و دعا منایا گیا جس میں راجگوپال اور ابو الکلام آزاد نے تقریریں کیں اور خوشی کے شادیانے بجائے!

کس قدر "قدرتی" "قومی" جذبات ہیں۔ پنڈت نہرو نے معذرت خواہانہ انداز میں یہ بھی کہہ دیا کہ "میں مرد امن ہوں اور مجھے انتہائی مجبوری[1] کے عالم میں پولیسی کارروائی کرنی پڑی ہے"۔ لیکن دنیا نے اس "اقدام" یتو ہار۔ کو کس قدر غلط سمجھا اور غلط رنگ میں پیش کیا۔ کرشنا مینن ہندوستان کے انگلستانی ہائی کمشنر کو برطانوی اخبارات کو اس پر زجر و توبیخ بھی کرنا پڑی کہ وہ "تقریباً یک زبان ہو کر ہندوستان کو ظالم اور حیدر آباد کو مظلوم بتا رہے ہیں اسے پولیسی کارروائی کے محاسن پر باقاعدہ درس دینا پڑا۔ ادھر امریکہ میں یہی مصیبت پیش آئی۔ وہاں کی "جاہل" اور "بے خبر" قوم کو سمجھانے کا گراں بار فریضہ راما راؤ سفیر ہند نے سرانجام دیا۔ اہل امریکہ اتنا بھی تو نہیں جانتے تھے۔ کہ ظالم (aggressor) کون ہوتا ہے۔ چنانچہ انہیں سمجھایا گیا کہ حملہ ظلم پر مبنی ہوتا ہے اور جوع الارض کی تسکین کیلئے ہوتا ہے۔ ہندوستان کا ہرگز یہ مقصد نہیں "

ہندوستان کے نیم سرکاری اخبار نے اقوام متحدہ کے ہندوستانی نمائندوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس ایک نقطہ کو اقوام متحدہ کے ارکان کے سامنے واضح کریں کہ ہندوستان نے حیدر آباد کے خلاف فوج نہیں استعمال کی بلکہ اپنی "پولیس" بھیجی ہے۔ چنانچہ ہڈ لپا لانے یہی سر الاپتے ہوئے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں کہا کہ اقوام متحدہ کا منشور "ہم یعنی جمہور" کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے نہ کہ "ہم یعنی حکمران" یا "ہم یعنی شاہزادگان" کے الفاظ سے۔ گویا نظام حیدر آباد کو کہ ریاست کا حکمران ہے، یہ حق حاصل نہیں۔ کہ وہ اپنی ریاست سے متعلق کچھ فیصلہ از خود کرے۔ مسز وجے لکشمی اپنے بھائی سے بھی آگے بڑھ گئی اور اقوام عالم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جس برق رفتاری سے ہندوستان نے حیدر آباد میں ہمہ گیر بدامنی کو ختم کیا ہے اگر اس رفتار سے بدامنی کا استیصال فلسطین، برما، ملایا اور دیگر ممالک سے کیا جائے تو دنیا خوشحال ہو جائیگی۔ گویا ہندوستان نے حیدر آباد پر حملہ کر کے قابل مذمت اقدام نہیں کیا بلکہ ایک قابل تقلید مثال پیش کی ہے۔

ہندوستان کا گورنر جنرل اس دور میں کہاں پیچھے رہ سکتا تھا؟ وہ نہرو کی طرح جغرافیہ کا شوقین بھی معلوم ہوتا ہے۔ جامع مسجد دہلی[2] میں ۲۶ ستمبر کو تقریر کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

---

[1] یہ مجبوری اور اس کی انتہا کیا تھی؟ اس کا جواب اس وقت مناسب نہیں کیونکہ یہ نہرو اور پٹیل کے باہمی سربستہ راز ہیں!

[2] چنانچہ یہ اخبار ایک طرف اندرون ہند تو تعلّی اور رعونت سے یہ کہہ رہا ہے کہ ہماری فوجوں نے حیدر آباد کو فتح کر لیا۔ اور دوسری طرف وہ دنیا کو یہ بتا رہا ہے کہ نظام کی فوجیں تو ہندوستانی فوجوں کے مقابلہ میں آئیں ہی نہیں!

[3] شاید یہ سوامی شردھانند کی اس تقریر کی سالگرہ ہو جو خلافت تحریک کے دوران میں اس نے جامع مسجد دہلی کے منبر سے کی تھی۔

جو لوگ ہندوستان پر نکتہ چینی کرتے ہیں وہ حیدرآباد کا جغرافیہ نہیں جانتے اور یہ بھی نہیں جانتے کہ اس کے حالات اور اس کے باشندوں کی خواہشات کیا ہیں۔

ہم پر الزام دینے والے خیال کرتے ہیں کہ چونکہ برطانوی قانون والوں نے یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ برطانوی اقتدار ختم ہو گیا ہے حیدرآباد آنا فانا جو تھا وہ نہیں رہا اور ایک علیحدہ قوم بن گیا ہے۔ یہ حماقت ہے۔

اس کے بعد راجہ جی نے اپنی جمہوریت پسندی کے معصوم عزائم کا مزید ڈھنڈورہ یوں پیٹا ہے کہ ہم جمہور حیدرآباد کو موقع دیں گے کہ وہ اپنی حکومت اپنی منشاء کے مطابق مرتب کریں۔

اب ذرا ان بھانت بھانت کی بولیوں کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔ راجہ جی نے جس انداز سے قانون آزادی ہند (۱۹۴۷ء) کا مذاق اڑایا ہے وہ ایک گورنر جنرل کے شایانِ شان نہیں۔ نہرو کی وزارت عظمےٰ راجہ کی گورنر جنرلی بلکہ خود ہندوستان کی آزادی نتیجہ ہیں اس قانون کا جس کا یوں استخفاف کیا جا رہا ہے۔ اس کے میٹھے کو تو راجہ جی نے ہڑپ کر لیا لیکن کڑوے کو تھوک رہے ہیں۔ یہ سیاست نہیں تدبر نہیں، اخلاق و مروت ایسے صفات عالیہ کا اس وادی میں گزر کہاں! اس قانون نے ایک طرف ہندوستان کو آزادی بخشی دوسری طرف ہندوستانی ریاستوں کو یہ حق دیا کہ وہ چاہیں تو آزاد رہیں۔ چاہیں تو پاکستان یا ہندوستان سے الحاق کر لیں۔ یہ حقیقت کس کیلئے کتنی ناگوار کیوں نہ ہو حقیقت ضرور رہتی ہے۔ ہندوستان کا پیچ و تاب قابل فہم ہے لیکن وہ قانون کے لکھے کو کیسے مٹا سکتا ہے؟ اس کے پاس دلیل نہیں۔ اور دلیل کی کمی وہ تلوار سے پوری کرنی چاہتا ہے۔ اگر اس کے پاس کافی قوت ہے اور وہ اسے استعمال کرنا ہی چاہتا ہے تو تلوار کو تلوار کیوں نہیں کہتا؟ وہ یہ کیسے توقع کر سکتا ہے کہ اس کی تلوار کو دنیا عقل کی دلیل تصور کرے۔

راجہ جی کی شادیانہ CHAUVINISTIC جغرافیہ دانی نے معترضین کو حیدرآباد کے جغرافیہ سے بے خبر بتایا ہے۔ نہرو بھی اس مردود جغرافیہ کے منسوخ ابواب کئی بار پڑھا اور سنا چکا ہے لیکن مسلمانوں کی روح قومی نے اس علم جغرافیہ کو دنیا بھر میں رسوا کر دیا ہے۔ راجہ جی کو جاننا چاہیئے کہ نہ محض حیدرآباد آنا فانا بدل گیا بلکہ خود ہندوستان بدل گیا ہے۔ اس کی تقسیم آپ سب کی مخالفت کے علی الرغم ہو چکی ہے۔ مسلمان قانون ہند (۱۹۴۷ء) کی رو سے علیحدہ قوم بن چکا ہے اور علیحدہ ملک کا مالک ہو چکا ہے۔ آج راجہ جی حیدرآبادی مطالبہ آزادی کا تمسخر اڑا رہے ہیں۔ کل وہ پاکستان کی علیحدگی کا بطلان کر دیں گے۔ نہرو اس ضمن میں ایک قدم آگے بڑھ چکا ہے۔ فتح حیدرآباد کے نشہ میں بدمست اور آپے سے باہر ہو کر نہرو نے پاکستان کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ وہ ہندوستان سے خائف

حضرت مولانا" ابوالکلام صاحب آزاد قبلہ رو ہو کر نہایت خشوع و خضوع سے فرماتے ہیں کہ
میں خدا کے اس مقدس گھر میں اعلان کرتا ہوں کہ گذشتہ ڈیڑھ برس
میں ہماری حکومت نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے وہ خدا یا انسانوں
کے سامنے شرمسار ہو۔ (ہندوستان ٹائمز ۴۸-۹/۲۷)

اور یہی ہے وہ مقام جہاں حضرت لوطؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ الیس منکم رجل رشید؟ کیا تم میں ایک شریف انسان بھی باقی نہیں رہا؟

ان حقائق کو پیش نظر رکھئے اور پھر سوچئے کہ ہندوستان جو نسکاری کتے پال رہا ہے وہ انسانیت کا خون طلب کریں گے۔ اس ضحاک کے کندھوں پر جو سانپ لہرا رہے ہیں ان کیلئے ہر روز انسان ذبح ہوں گے ــــ ہوتے رہیں گے۔ تا آنکہ درفش کاویانی لہرانے والا کوئی فریدوں اس کی کمر نخوت و فرعونیت توڑ دے۔ ہندوستان امن عالم کیلئے عظیم خطرہ ہے اس کا تدارک پاکستان کا ہی نہیں اقوام عالم کا اولیں فریضہ ہے۔

(بقیہ صفحہ ۹۷) اور مطالبہ کرے کہ وہ ایسے مشتبہ شخص کو فی الفور واپس بلا لے اور اس کی بجائے کسی ایسے صاحب کو اس فریضہ پر مامور کرے جو آئینی حدود میں رہ کر دیانت داری اور ذمہ داری کا بہتر ثبوت دے سکے۔ دنیا کا کوئی ملک ایک لمحہ کے لئے ایسے خطرناک غیر ملکی کو برداشت نہیں کر سکتا ہم خصوصیت سے یہ امر حکومت کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں کہ وہ معاملہ کے اس پہلو کو نظر انداز نہ کرے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پرسرام محض علامت ہے اور علت مرض اس کا ہائی کمشنر ہے۔ اور اس کے لئے ہم مرکزی حکومت کے ارباب حل و عقد کی خصوصی توجہ اس حقیقت کی طرف پھر منعطف کرانا چاہتے ہیں کہ اس زہر افشانی کا علاج محض تقریروں میں اشارات اور اخباروں میں تذکار نہیں۔ "پرسرام" مملکتِ پاکستان کی رگوں میں خون فاسد کی طرح دوڑتے پھر رہے ہیں۔ کوئی ہندو کے لباس میں۔ کوئی مسلمان کی شکل میں۔ اس کے استیصال کے لئے نوک نشتر کی ضرورت ہے۔ اور فوری ضرورت۔ یاد رکھئے۔ کوئی غیر مسلم مسلمانوں کا بہی خواہ نہیں۔ اور کوئی مسلمان جو تقسیم ہند سے پہلے نیشنلسٹ خیالات رکھتا تھا، پاکستان کا حامی نہیں۔

(یہ تبصرہ روزنامہ ڈان کی اس اطلاع پر مبنی ہے جو یکم اکتوبر کی اشاعت میں شائع ہوئی۔ طلوعِ اسلام)

وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ

(بچھڑے کی محبت ان کے دل کی گہرائیوں میں گھر کر چکی تھی)

کچھ عرصہ سے ارباب حکومت دشمنان پاکستان کا بہ تکرار ذکر کرتے چلے آرہے ہیں۔ ہم نے بارہا اس سرراہے ذکر کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ ایسے دشمنان ملک وحکومت اوران کی تخریبی سرگرمیوں کو پوری طرح بے نقاب کرنا چاہیئے تاکہ جمہور ان کے دام تزویر سے آگاہ ہو کر بچ سکیں، نیز اعدائے وطن کے خلاف فوری اور ہمہ گیر تعزیری کارروائی کرنی چاہیئے یہ کہنا کہ پاکستان میں تخریبی عناصر موجود ہیں ایک مسلمہ حقیقت کو دہرانا ہے۔ یہ امر بھی مخفی نہیں کہ ان عناصر تخریب کا مرکز اور سرچشمہ ہدایت کونسا ہے۔ ففتھ کالم وہ مرض دق ہے جو مریض "ملک کو اندر سے دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے۔ بین الاقوامی سیاست میں سلطنتوں کو الٹنے اور "اندرونی" انقلاب برپا کرنے کا یہ بدترین حربہ ہے۔ اس زہر کا ہمارے جسد سیاست میں سرایت کر جانا اور رگوں میں دوڑتے پھرنا ہلاکت اور موت کا پیش خیمہ ہے۔ پاکستان جن اہم مسائل ومشکلات سے دوچار ہے وہ اظہر من الشمس ہیں۔ ہر حکومت کیلئے بالعموم اور پاکستان جیسی نوزائیدہ سلطنت کے لئے بالخصوص داخلی امن کی اشد ترین ضرورت ہے۔ ہم نے جب ارباب حکومت سے پوری قوت سے عملی قانونی کارروائی کرنے کا مطالبہ کیا تھا تو ہمیں ڈر تھا کہ اس عظیم الشان خطرہ کا کماحقہٗ احساس نہیں کیا گیا۔ ہمارے اس ڈر کو اس حیران کن، اور بظاہر ناقابل یقین خبر نے تقویت دیدی ہے کہ سندھ کے وزیر اعظم پیر الٰہی بخش صاحب کا پرسنل اسسٹنٹ پرسرام جس کے سپرد حکومت کی خفیہ دستاویزات کی پیروی و نگرانی تھی، ہندوستان بھاگتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا ہے اور اس کے قبضہ سے حکومت کی خفیہ دستاویزات برآمد ہوئی ہیں۔ یہ دستاویزات نامہ نگار ڈان کی اطلاع کے مطابق، ٹرکوں، موٹر کاروں، جیپوں، ریلوں اور دیگر اہم مقامات سے متعلق ہیں جنہیں صوبہ سندھ میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

ہمیں اس پر مطلقاً اچنبا نہیں ہوا کہ پرس رام ہندو نے یہ خیانت کارانہ اقدام کیا۔ لیکن ہمیں حیرت دامنگیر ہے تو اپنی ملت کے "ستارے" صوبہ سندھ کے وزیر اعظم پیر الٰہی بخش صاحب پر کہ جنہوں نے نہ محض دشمن پر تمام راز کھولے بلکہ کلیتہً ان کو اسی کی تحویل میں دیدیا۔ نامہ نگار ڈان نے جب آپ سے یہ قدرتی سوال کیا کہ آپ نے اس سانپ کو اپنی آستین میں کیوں جگہ دی ؟ تو آپ نے فرمایا کہ پرس رام چھ سات سال سے اسمبلی کا رپورٹر تھا، لیکن جب مسٹر کھورو وزارتِ عظمیٰ سے برطرف ہوئے! اور ان کے ساتھ ان کا پرسنل اسسٹنٹ بھی جاتا رہا تو اس وقت پیر صاحب نے پرس رام کو منتخب کیا اور خفیہ امور کا امین بنا دیا۔ ملاحظہ کیجئے اس جواب کو اور ماتم کیجئے اپنی بدبختی پر!

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن ۔۔۔ کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

ایک معمولی ہندو کلرک کی ہشیاری کا موازنہ صوبہ بھر کے مسلمان وزیر اعظم کی سادگی سے کیجئے۔ وہ کتنا بڑا فریب دے رہا ہے اور

یہ اس کی دیانت اور امانت کا دستاویزی ثبوت ہیں! اگر صوبہ سندھ کا وزیر اعظم مرکزی حکومت کے زیر سایہ ملک کے ڈیفنس سے یوں کھیل سکتا ہے تو کس سے کس کی شکایت کیجئے گا!!

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ ۳ ستمبر کو پرس رام گرفتار ہوتا ہے اور ۸ ستمبر کو مسٹر اور مربی وزیر اعظم پنت (وزیر اعظم یو۔پی) اور کھیر (وزیر اعظم بمبئی) کے نام ایک مبالغہ آمیز خط میں پرس رام کی دیانت کی تعریف کرتے ہیں اور یہ سفارش کرتے ہیں کہ وہ جرتم کے خفیہ امور کیلئے مفید ثابت ہوگا۔ سندھی وزیر اعظم کی یہ رائے کس قدر صحیح نکلی۔ ایک اطلاع سے پتہ چلتا ہے کہ پرس رام چار ماہ کی چھٹی جا رہا تھا۔ اگر وہ چھٹی گزارنے جا رہا تھا اور اسے پھر پاکستانی ملازمت پر حاضر ہونا تھا تو اس سفارشی خط کا کیا موقع تھا اگر اسے واپس نہیں آنا تھا تو ہم وزیر اعظم سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ انتخاب کرتے وقت یہ نہیں جانتے تھے کہ پرس رام ہندوستان جا سکتا ہے یا کیا انہیں اس کا بھی علم نہیں تھا کہ پرس رام ہندو ہے؟ اور ہندو پاکستان کو اپنی شکست سمجھتا ہے جس کے داغ کو دھونے کیلئے وہ ہر وقت پیچ و تاب میں ہے؟ کیا وہ ہندو کی سرشت اور طینت کو اتنی جلدی بھول گئے؟ کیا تمام صوبائی ملازموں میں ایک بھی امین مسلمان نہیں تھا؟ کیا سارے پاکستان کے مسلمانوں میں پیر صاحب کی نظر انتخاب صرف پرس رام پر ہی جم سکی اور کوئی ایک بھی ایسا نہ نکل سکا جو ان کا اعتماد حاصل کر سکتا؟

بعض حلقوں میں کہا جا رہا ہے کہ پیر صاحب اس سنگین غلطی پر از حد پشیمان ہیں۔ یہ پشیمانی غالب کے زود پشیمان قاتل کی پشیمانی کی یاد دلاتی ہے جس نے قتل کے بعد جفا سے توبہ کی تھی۔ یہ وہ جرم نہیں جس کی تلافی پشیمانی اور ندامت سے ہو جائے۔ یہ پیر صاحب کا ذاتی معاملہ نہیں۔ یہ ملک و ملت کا سوال ہے۔ یہ لاکھوں کروڑوں جانوں کا سوال ہے۔ یہ خود پاکستان کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس معاملہ کو اس سطحی عذر گناہ پر یہیں ختم کر دیا جائے۔ یہ معاملہ از حد سنگین ہے اور وزیر اعظم کے مفدشی خط نے اسے اور سنگین بنا دیا ہے۔ بد خواہان پاکستان کو بربادی کا تخم خبیث بونے کیلئے زرخیز زمین کی ضرورت ہے اور اگر صوبوں کے وزیر اعظم تک اس سازش کا شکار ہو سکتے ہیں تو عوام کا کیا پوچھنا! یہ تو نہال دشمنی تھا لیکن ہمیں اب بھی بعض جگہ کھلے خنجر نظر آ رہے ہیں۔ کیا ارباب حکومت اس واقعہ سے جرأت حاصل کریں گے اور اپنی اپنی دہلیز کو بروقت صاف کر دیں گے؟

اس معاملہ کی سنگینی کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ پرس رام کے قبضہ سے جو خطوط برآمد ہوئے ہیں، ان میں سے ایک خط ہندوستان کے ہائی کمشنر متعین کراچی (سری پرکاش) کا ہے۔ جس میں تحریر ہے کہ پرس رام محکمہ دفاع کے لئے مفید ہوگا۔ ہندوستانی ہائی کمشنر کے اس خط سے ایک بین المملکتی ڈپلومیٹک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا سری پرکاش کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کا ہائی کمشنر ہوتے ہوئے ایسے سازشیوں اور باغیوں کی نہ صرف پشتیبانی کرے بلکہ انہیں سرچشمۂ نجات سے بطور رو اسطہ وابستہ متعلق کرے بالفاظ صحیح تر ہائی کمشنر ہندوستانی مفاد کی نگہداشت کے لئے متعین ہے اور اس حیثیت سے اسے چند مراعات حاصل ہیں۔ کیا وہ ان جائز آئینی فرائض کے علاوہ خفیہ سرگرمیوں کا مرکز بھی ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو وہ پاکستان میں کسی مروت کا مستحق نہیں اس نے ڈپلومیٹک رواداری کو ٹھکرا دیا ہے۔ حکومت پاکستان کو چاہیئے کہ وہ اس کے خلاف حکومت ہندوستان سے احتجاج کرے

بقیہ صفحہ ۹۶ پر دیکھئے